قرآن وحدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

# کتاب و سنت

اکتوبر-دسمبر 2025

قرآن وحدیث کے متعلق اردو زبان کا پہلا سہ ماہی مجلہ محکمہ

# کتاب وسنت

جلد-01 | اکتوبر-دسمبر 2025 | شمارہ-04

**مدیر**

شاہ اجمل فاروق ندوی

**معاونین**

عبداللہ شیرازی، محمد عمران

**خط وکتابت کا پتہ**

**KITABOSUNNAT QUARTERLY**
G-5/A, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Email: info@kitabosunnat.in
+91-9873298015 | +91-9654058854

# غزل

فارسی کلام: مولانا عبدالرحمن جامی　　اردو ترجمہ: شاہ اجمل فاروق ندوی

ایں قدَر مَستم کہ از چشمَم شراب آید بروں　　وَز دلِ پُر حسرتم دُودِ کباب آید بروں

مست ہوں اتنا کہ آنکھوں سے چھلکتی ہے شراب
اور سلگتے دل سے اٹھتا ہے دھواں مثل کباب

ماہِ من در نیم شب چوں بے نقاب آید بروں　　زاہدِ صد سالہ از مسجد خراب آید بروں

رات کو جب چاند میرا گھر سے نکلا بے نقاب
شیخ بھی مسجد سے نکلے کھاتے کھاتے پیچ و تاب

صُبح دم چوں رُخ نمودی شُد نمازِ من قضا　　سجدہ کے باشد روا چوں آفتاب آید بروں

دیکھتے ہی تیرا چہرہ فجر ہوتی ہے قضا
سجدہ ہو کیسے ادا آئے نظر جب آفتاب

ایں قدَر رندَم کہ وقتِ قتل زیرِ تیغِ اُو　　تجائے خوں از چشمِ من موجِ شراب آید بروں

میں ہوں ایسا مست وقتِ قتل اس کے زیرِ تیغ
بہہ پڑی آنکھوں سے میری خون کے بدلے شراب

یارِ من در مکتب و من در سرِ رہ منتظر　　منتظر بودم کہ یارم با کتاب آید بروں

یار ہے مکتب میں اور میں ہوں سرِ رہ منتظر
منتظر ہوں کب وہ نکلے ہاتھ میں لے کر کتاب

قطرہ دردِ دلِ جامی بہ دریا اُوفتد　　سینہ سوزاں، دل کتاں، ماہی ز آب آید بروں

بوند گر جامی کے دردِ دل کی ندی میں گرے
مچھلیاں بھی نیم جاں آجائیں گی بیرونِ آب

# فہرست

**اداریہ**

| | | |
|---|---|---|
| اسمائے حسنیٰ-معرفت اور انقلاب | شاہ اجمل فاروق ندوی | 07 |

**قرآن اور صاحب قرآن** 09-62

| | | |
|---|---|---|
| قرآن اور انسانی تخلیق | پروفیسر شہزاد الحسن چشتی | 11 |
| کارپس قران کیم: مستشرقین کا قرآن مجید پر حالیہ نقد ونظر | پروفیسر عبدالرحیم قدوائی | 23 |
| قرآن مجید میں حصول جنت کی ترغیب | سیّد قطب شہید | 51 |
| اسماء القرآن | ہدایت اللہ خاں | 55 |

**سنت اور صاحب سنت** 63-84

| | | |
|---|---|---|
| حدیث: اصول، تخریج، تدریس | مولانا خالد سیف اللہ رحمانی | 65 |
| الأدب المفرد کی اردو میں شرح وترجمانی: ایک اجمالی خاکہ | ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی | 75 |

**متفرقات** 85-90

| | | |
|---|---|---|
| تحقیق مقاصد اور مناہج | شاہ اجمل فاروق ندوی | 87 |

# اسمائے حسنیٰ-معرفت اور انقلاب

اسلام کا پورا نظامِ عقیدہ، نظامِ عبادات اور نظامِ اخلاق جس حقیقت کے گرد گھومتا ہے وہ ہے معرفتِ الٰہی۔ اور معرفتِ الٰہی کا سب سے روشن، منظم اور مؤثر باب اسمائے حسنیٰ ہیں۔ قرآنِ کریم نے جہاں توحید کو دلیل سے واضح کیا، وہیں اسے دلوں میں زندہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو بار بار پیش کیا۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ اسماء کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آپ نے اسمائے حسنیٰ کی تعداد بھی طے فرمائی اور انھیں ترتیب سے گنا بھی دیا۔

اسمائے حسنیٰ کی تعداد کے متعلق جمہور کا مسلک یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ ان 99/اسماء میں محدود نہیں ہیں۔ یہ اسماء تو انسان کی اوقات کے لحاظ سے بتا دیے گئے ہیں۔ ان اسماء کو سمجھتے سمجھتے ہی نسلیں کی نسلیں ختم ہو جائیں گی اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے ایک اسم پاک پر بھی انسان کی عمریں ختم ہو جائیں۔ یہ اسمائے مبارکہ علم و عرفان اور حقائق و معانی کا ایک سمندر اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بس 99/اسماء بتانے پر اکتفا فرمایا۔

اسمائے حسنیٰ کے متعلق شروع ہی سے سلفِ صالحین نے کتابیں لکھیں۔ موجودہ دور میں بھی اس موضوع پر مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ البتہ جن کتابوں کو سب سے اہم مرجع کی حیثیت حاصل ہے اُن میں امام ابو اسحاق زجاج (وفات 311ھ) کی تفسیر أسماء الله الحسنى، امام ابو حامد غزالی (وفات 505ھ) کی المقصد الأسنى، امام فخر الدین رازی (وفات 605ھ) کی لوامع البینات شرح أسماء الله تعالى و الصفات، امام محمد ابن احمد قرطبی (وفات 671ھ) کی الأسنى في شرح أسماء الله الحسنى سرِفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ جن مفسرین، محدثین، صوفیہ اور متکلمین نے اپنی کتابوں میں مختلف اسمائے حسنیٰ کی جو تشریحات کی ہیں، وہ بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

امام ابو علی دقاق (وفات 405ھ) نے اس سلسلے میں بہت نفیس گفتگو فرمائی ہے۔ کہتے ہیں:

> المعرفة على لسان العلماء هو العلم، فكل علم معرفة، و كل معرفة علم، و كل عالم بالله عارف، و كل عارف عالم، و عند هؤلاء القوم المعرفة صفة من عرف الحق سبحانه بأسمائه و صفاته۔ (الرسالة القشيرية، ج دوم، ص 460، ط المكتبة التوفيقية، قاهره، 2015)

علماء کی زبان میں معرفت دراصل علم ہی کا دوسرا نام ہے؛ چنانچہ ہر علم معرفت ہے اور ہر معرفت علم۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا عالم ہے وہ عارف بھی ہے اور جو عارف ہے وہ عالم بھی۔ ان حضرات کے نزدیک معرفت اُس صفت کا نام ہے جس کے ذریعے کوئی شخص حق سبحانہ وتعالیٰ کو اس کے اسماء و صفات کے ساتھ پہچان لے۔

اس میں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اسمائے حسنی کا تعلق کسی خاص فرقے، مسلک، مشرب یا منہج سے بھی نہیں ہے۔ان کی اہمیت وعظمت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ یوں تو ان پاکیزہ ناموں کا تعلق کسی مذہب سے بھی نہیں ہے۔ یہ کائنات کے خالق ومالک کے مقدس نام ہیں۔ اس لیے یہ اسلام کی نہیں، انسانیت کی چیز ہیں۔لیکن بدقسمتی سے ''اللہ'' کو مسلمانوں کا خدا سمجھ لیا گیا اور ہم مسلمانوں نے سمجھنے دیا،اس لیے اسمائے حسنی کو کم از کم تمام مسلم گروہوں کو ضرور سمجھنا سمجھانا، پڑھنا پڑھانا اور اپنے جسم وروح کا حصہ بنانا چاہیے۔

اس ذیل میں کچھ کرنے کے کام یہ ہو سکتے ہیں:

1-اسمائے حسنی کی تشریحات پر مشتمل ایک مفصل انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب۔اس میں ہر اسم پاک پر مقامی زبانوں میں لغوی تحقیق، قرآنی استعمال،حدیثی استعمال،سلف صالحین کی تشریحات،ایمانی اثرات اور عملی تقاضے کا مفصل بیان ہو۔

2-اسی طرح معصوم ذہنوں میں اسمائے حسنی کو بٹھانے کے لیے دلکش، آسان اور دلچسپ کتابیں تیار کرنی چاہئیں۔ان کے موضوعات بچوں کی مناسبت سے یہ ہو سکتے ہیں: اللہ کون ہے؟ رب کا کیا مطلب ہے؟ مجھے کس نے پیدا کیا؟

3-چند ماہ پر مشتمل معرفتِ الٰہی کورس کا آغاز۔ہمارا احساس ہے کہ اس طرح کے کورسز کے ذریعے نئی نسل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پیدا کرنے اور عصری مسائل کے حل کے لیے صبر، شکر، توکل، دیانت اور اور خوف ورجا جیسے پاکیزہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر ہونی چاہیے۔اس کورس میں یومیہ یا ہفتہ وار کلاسز کے ذریعے اسمائے حسنی کی تفہیم اور ہر شریک کو اسمائے حسنی معانی کے ساتھ یاد کرائے جا سکتے ہیں۔

4-اس کے علاوہ اسمائے حسنی ورک شاپس کا انعقاد اور سوشل میڈیا پر اسمائے حسنی مہم کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔ساتھ ہی اسمائے حسنی پر مبنی خطباتِ جمعہ سیریز بھی چلائی جا سکتی ہے۔

اگر یہ کام کیے جائیں تو قوی امید ہے کہ معاشرے میں تعلق مع اللہ کی مضبوطی، اخلاص، اخلاقی اصلاح، اتحاد واتفاق اور دینی ودعوتی شعور میں اضافہ ہوگا۔

آئیے! اسمائے حسنی کو علمی تحقیق، تربیتی پروگرام اور دعوتی تحریک کی صورت میں زندہ کریں، تاکہ معرفتِ الٰہی صرف کتابوں میں نہ رہے بلکہ دلوں میں اترے اور زندگیوں کو بدلے۔

شاہ اجمل فاروق ندوی

...

# قرآن اور صاحب قرآن

# قرآن اور انسانی تخلیق

پروفیسر شہزاد الحسن چشتی

اللہ پر ایمان اسلام کے نظامِ عقائد کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس پر یقین کے بغیر دعوائے اسلام بے حقیقت ہے۔ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ اللہ اس کائنات کی بدیہی حقیقت ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی ہمسر نہیں اور نہ کوئی اس کا شریک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے۔ کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر شے اللہ ہی نے تخلیق کی ہے اور انسان کو بھی خصوصیت سے اُسی نے پیدا کیا ہے۔

اللہ نے انسان کو برگزیدہ اور خاص انسانوں (پیغمبروں) کے ذریعے کرۂ ارض پر زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس عقیدے کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات اور اس کی تمام موجودات اور انسان کو اللہ اور صرف اللہ ہی کا تخلیق کردہ تسلیم کیا جائے۔ قرآن حکیم میں اس بات کو جگہ جگہ بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سجدہ آیات ۴، ۵ میں فرمایا: وہ اللہ ہی ہے جس نے

> پہلے انسانی جوڑے (آدم وحوا) کی تخلیق کا مقام جنت ہے۔ اس جنت میں مٹی بھی ہے اور پانی بھی، پھلواری اور پھل دار درخت بھی ہیں اور نہریں بھی۔ غرض انسان کی ضرورت کی ہر چیز بہترین صورت میں موجود ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد سعید روحیں اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کی روحیں قیام کرتی ہیں۔ اس کا نام جنت الماویٰ ہے۔ یہ جنت سدرۃ المنتہیٰ پر واقع ہے۔

آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، چھے دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ سورۂ روم آیت ۸ میں بیان ہے: کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ پر غور وفکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور مدت مقررہ کے لیے پیدا کیا ہے۔

انسان کی تخلیق کے بارے میں خصوصیت سے سورۂ اعراف آیت ۱۰ر میں بیان ہے: ہم نے تمھاری (انسان کی) تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو۔ آگے آیت ۱۸۹ر میں فرمایا: وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کر سکے۔ سورۂ فاطر آیت ۱۱ر میں وضاحت اس طرح کی گئی: اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر تمھارے جوڑے بنائے، کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب اللہ کے علم میں ہوتا ہے"۔ بلاشبہ اللہ رب العزت نے ہی انسان کو تخلیق کیا ہے۔

## فرشتوں کو تخلیقِ انسان سے مطلع کرنا

قرآن میں ہے: اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا: تم انھیں (فرشتوں کو) ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ پھر ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جھک جاؤ۔ (البقرہ ۳۰-۳۴) اللہ نے فرشتوں کو بھی علم عطا فرمایا ہے۔ اس لیے کہ علم کے بغیر وہ بھی اپنی ذمے داریاں ادا نہیں کر سکتے۔ فرشتوں اور انسان کے علم میں فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا جو گروہ جس خاص ذمے داری پر مامور ہوتا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات انسان کی معلومات سے زیادہ ہیں مگر اپنے شعبے کے علاوہ دوسرے تمام شعبوں میں ان کی معلومات صفر ہیں، جب کہ انسان کا علم ہمہ گیر ہے اور ہر مادی چیز کے بارے میں ہے۔ انسانی معاملات بہت سے فرشتوں کے سپرد ہوتا تھے اور ہیں۔ مثلاً دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے رب کی ہدایات و رہنمائی پہنچانا، انسان کے روزمرہ اعمال کا ریکارڈ رکھنا، انسان کی موت و حیات کا ریکارڈ ترتیب دینا اور انسان کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات بجالانا وغیرہ۔ اس طرح انسان کو فرشتوں اور جنوں پر علمی برتری حاصل ہے۔

## کائنات میں انسان کی تخلیق کا مقام

پھر ہم نے آدم سے کہا تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو۔ پھر ہم نے حکم دیا تم سب (آدم و حوا اور ابلیس) یہاں سے اُتر جاؤ۔ اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کرلیا" (البقرہ ۳۵-۳۶)۔ اسی طرح سورۂ اعراف آیت ۱۹/میں بیان ہوا ہے: پھر (ہم نے) آدم (سے کہا) تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو سہو اور جہاں سے چاہو (اور جو چاہو) کھاؤ مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ گنہگار ہو جاؤ گے"۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۳/میں کہا گیا ہے: تم دونوں یہاں سے نیچے اُتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کے دشمن (ہوں گے)۔ پھر اگر ہماری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گم راہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔ پھر الاعراف آیت ۲۵/میں فرمایا کہ اس (زمین) میں تمھارا جینا ہوگا، اسی میں تمھارا مرنا ہوگا اور اسی میں (قیامت کو زندہ کرکے) نکالے جاؤ گے"۔

یہ سب آیات قطعی طور پر شاہد ہیں کہ پہلے انسانی جوڑے (آدم و حوا) کی تخلیق کا مقام جنت ہے۔ اس جنت میں مٹی بھی ہے اور پانی بھی، پھلواری اور پھل دار درخت بھی ہیں اور نہریں بھی۔ غرض انسان کی ضرورت کی ہر چیز بہترین صورت میں موجود ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد سعید روحیں اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کی روحیں قیام کرتی ہیں۔ اس کا نام جنت الماویٰ ہے۔ یہ جنت سدرۃ المنتہیٰ پر واقع ہے۔ اس مقام تک معراج کی رات نبی کریم ﷺ تشریف لے گئے تھے اور آپ ﷺ کو اس جنت کا مشاہدہ بھی کروایا گیا تھا۔ سورۂ نجم آیت ۱۳ تا ۱۵/میں فرمایا گیا ہے: اور ایک مرتبہ پھر اس (محمد ﷺ) نے سدرۃ المنتہیٰ (بیری کا وہ درخت جو انتہائی سرے پر واقع ہے) کے پاس اُس کو اُترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس جنت کے قریب ہی اللہ رب العزت کا عرش ہے۔ سورۂ سجدہ آیت ۵/میں اس طرف اشارہ ہے: آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدابیر کرتا

ہے اور اس تدبیر کی روداد اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن، جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے۔ سورۂ معراج آیت ۴ رمیں یہ مقدار ۵۰ ہزار سال بیان کی گئی ہے۔

**جنت کی مٹی سے انسان کا پُتلہ بنانا**

اس جنت میں انسان کی تخلیق کے لیے استعمال کی گئی مٹی بھی ہے۔ اس مٹی کے بارے میں قرآنِ حکیم میں بیان ہوا ہے: ''اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا'' (فاطر ۳-۱۱) سورۃ الصّٰفّٰت آیات ۱۱-۱۲ میں بیان ہے: ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ پھر سورۂ رحمٰن آیت ۱۴ رمیں ہے: انسان کو اُس نے ٹھیکرے جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا ہے۔ پھر فرمایا: اُس (اللہ) نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ہست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے (السجدہ ۷-۹)

> اچھی صورت، متناسب جسم اور بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ درجے کی ساخت پر تخلیق کیا گیا ہے جس پر کسی اور جان دار مخلوق کو نہیں بنایا گیا۔ اسے یعنی انسان کو فکر و فہم اور عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں، جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں دی گئیں۔

قرآن میں انسانِ اوّل کے تخلیقی مادے کے لیے تُراب، طین، طین لازب، صلصال من حمإ مسنون اور صلصال کالفخار کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ تراب اور طین کے معنی خاک، مٹی اور گارے کے ہیں، جب کہ طین لازب کے معنی لیس دار گارے یا چکنی مٹی ہیں۔ صلصال کالفخار کے معنی ٹھیکرے جیسا سوکھا سڑا گارا یا ایسی مٹی جو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہو ہیں۔ صلصال من حمإ مسنون کا ترجمہ سید مودودی نے یوں کیا ہے:

> سڑی ہوئی مٹی کا سوکھا گارا اور تفہیمی حاشیہ یوں ہے: اُس (انسان) کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے، جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صلصال من حمإ مسنون کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ حمإ عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بو پیدا ہو چکی ہو یا بہ الفاظ دیگر خمیر اُٹھ آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی میں متغیر، منتن اور اِملس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی ہیں: مصوّر اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۰۴)

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسانِ اوّل کا تخلیقی مادہ ایسی مٹی ہے، جس کے ذرّات انتہائی باریک اور باہم متصل ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان ہوا نہیں ہوتی بلکہ پانی کی پتلی تہہ ہوتی ہے جس کے باعث ذرّات آپس میں چپک جاتے ہیں۔ پھر اس مٹی میں نامیاتی کیمیاوی مادّے ہوتے ہیں۔ یہ مادے مُردہ حیوانی اور نباتی ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں اور مٹی میں موجود زندہ

بیکٹیریا کے باعث سڑتے اور گلتے ہیں۔ان میں کیمیاوی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔اس وجہ سے مٹی میں لیس، چپک، سڑاند، یعنی بو پیدا ہوجاتی ہے اور مٹی سیاہی مائل ہوجاتی ہے۔ یہ مٹی کسی بھی قالب میں ڈھالنے کے لیے عمدہ ہوتی ہے اور سوکھ کر ٹھیکرے کی طرح بجتی ہے۔اس قسم کی مٹی کی عمدہ قسم کا اُس جنت میں پایا جانا جہاں انسانِ اوّل کی تخلیق کی گئی، زیادہ قرین قیاس ہے۔

اللہ رب العزت کے ہاتھوں انسان کی تخلیق سورۂ ص، آیت ۷۵ رمیں بیان ہوا ہے کہ رب نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کیا چیز اس (آدم) کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی، جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ اپنے دونوں ہاتھوں سے بنانے، یعنی بہ ذاتِ خود انسانی قالب میں ڈھالنے کا عمل آدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا بہت بڑا شرف ہے۔مٹی کو انسانی قالب میں ڈھالنے کی تفصیلات کا ذکر قرآنِ حکیم میں بیان نہیں ہوا۔بس یہ اشارہ ضروری ہے کہ ”اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہوجا اور وہ ہوگیا“۔(ال عمرٰن ۶۱)

روح سے مراد محض زندگی نہیں ہے، جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بل کہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکروشعور اور عقل وتمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحب ِشخصیت ہستی، صاحب اَنا پرستی اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔

**عمدہ اور شان دار تخلیق**

انسانی قالب بعض دودھ پلانے والے حیوانات سے بہت سی مشابہتوں کے باوجود ان سے منفرد اور اعلیٰ ہے۔قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اس طرف اشارہ ہے: اور (اللہ نے) تمھاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے“ (التغابن ۶۳: ۳)۔سورۃ التین آیت ۴ رمیں فرمایا: بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر تخلیق کیا۔پھر سورۂ انفطار آیت ۱۰ رمیں مزید وضاحت اس طرح کی اے انسان-جس نے (اللہ نے) تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور اس کو جس طرح چاہا جوڑ کر تیار کیا“۔

اچھی صورت، متناسب جسم اور بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ درجے کی ساخت پر تخلیق کیا گیا ہے جس پر کسی اور جان دار مخلوق کو نہیں بنایا گیا۔اسے یعنی انسان کو فکروفہم اور عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں، جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں دی گئیں۔سیدھا قامت یا کھڑا قد اور اس کے ساتھ مناسب اور متناسب ترین پاؤں اور ہاتھ دیے گئے ہیں، جن کے باعث وہ سیدھا کھڑے ہوکر چلتا پھرتا ہے اور توازن قائم رکھتا ہے، جب کہ کوئی حیوان سیدھا دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔اس کو بولتی ہوئی زبان دی گئی ہے، جب کہ کوئی حیوان دو لفظ بھی نہیں بول سکتا۔خوب صورت آنکھیں، ناک اور کان عطا ہوئے ہیں، جو سب اسے ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے، توازن قائم کرنے اور اپنی ضروریات تلاش کرنے میں مددگار ہیں۔اس کو سوچنے، سمجھنے اور معلومات جمع کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے کے لیے ایک اعلیٰ دماغ دیا گیا ہے۔اس کو ایک اخلاقی حس اور قوتِ تمیز دی گئی ہے،

جس کی بنا پر وہ بھلائی اور برائی اور صحیح اور غلط میں فرق کرتا ہے۔ اس کو ایک قوتِ فیصلہ دی گئی ہے، جس سے کام لے کر وہ اپنی راہِ عمل کا خود انتخاب کرتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ اپنی کوششوں کو کس راستے پر لگائے اور کس پر نہ لگائے۔ اس کو یہاں تک آزادی دی ہے کہ چاہے تو اپنے خالق کو مانے اور اس کی بندگی کرے ورنہ اس کا انکار کر دے یا جن جن کو چاہے اپنا رب بنا بیٹھے یا جسے رب مانتا ہو اس کے خلاف بغاوت کرنا چاہے تو کر گزرے۔ ان ساری قوتوں اور سارے اختیارات کے ساتھ اُسے اللہ نے اپنی پیدا کردہ بے شمار مخلوقات پر تصرف کرنے کا اختیار دیا ہے اور وہ عملاً اس اختیار کو استعمال بھی کرتا ہے۔

انسانی جسم یا قالب عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے اتفاقاً نہیں بن گیا ہے بل کہ ایک خدائے حکیم و دانا نے اسے مکمل صورت میں ترکیب دیا ہے یعنی نِک سُک سے درست کیا، تناسب قائم کیا اور جس طرح چاہا جوڑ کر تیار کر دیا۔ یہ جسم یا قالب دودھ پلانے والے (دودھیلے) جانور اور انسان سے کس قدر مشابہ، حیوانات مثلاً بندر، لنگور، گوریلا، بن مانس وغیرہ سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ مثلاً جسم کے تمام حصے ڈھانچا، ہاضمہ، دورانِ خون کا نظام، عضلات، اعصاب اور نظام تولید وغیرہ، سب حیوانات سے مماثل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمِ حیوانیات میں انسان دودھیلے حیوانات کی ہومو(Homo) نام کی ایک جنس (نوع) شمار ہوتا اور اس کا نام ہوموسیپینس (Homo Sepians) ہے۔ یہی نکتہ ہے جس کی بنا پر حامیین حیاتی ارتقا منطقی دلیل قائم کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ انسان اور یہ دودھیلے حیوانات مماثل ہیں؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ اس مماثلت کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہ انسان حیاتی ارتقا کے اصول پر حیوانات سے ترقی پا کر بنا ہے۔

دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور حیوانات کی یہی مماثلت وہ نکتہ ہے، جس پر غور و فکر کے نتیجے میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اور حیوانات دونوں ہی کو اللہ حکیم و علیم نے تخلیق کیا ہے۔ لٰہذا دونوں میں مماثلت اور مشابہت ہونا فطری اور لازمی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک ماہر سنگ تراش کے تراشے ہوئے مختلف مجسمے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اپنے اندر ایسی بنیادی مشابہتیں رکھتے ہیں، جس کی بنیاد پر مجسمہ سازی میں درک رکھنے والے پہچان لیتے ہیں کہ یہ سارے مجسمے کسی ایک ہی مجسمہ ساز کے تراشے ہوئے ہیں۔ یہ منطقی حقیقت اردگرد کے سارے ماحول میں رچی بسی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سادہ سی منطقی حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ سوائے اس بات کے کہ سائنس پرست وجودِ باریِ تعالیٰ کو تسلیم کرنے میں نفسیاتی اور روایتی مخالفت پر کمربستہ ہیں، جو انسانی شرف کو قبول کرنے میں مانع ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو انسان ہونے اور اُس کو خلیفہ فی الارض ہونے کے بہت بڑے شرف سے نوازتا ہے مگر یہ سائنسی بوجھ بجھکڑ اس کو اس شرف سے نیچے گرا کر ترقی یافتہ حیوان بنا دیتے ہیں۔

## آدم کے قالب میں روح کا پھونکا جانا

تخلیق آدم کے منصوبے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ آدم کے قالب بنا دیے جانے اور خشک ہو جانے کے بعد اللہ نے اس قالب میں اپنی روح پھونکی اور دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا یہ قالب گوشت پوست کے متحرک انسان میں تبدیل ہو گیا۔ سورۃ السجدہ آیت ۹ رمیں اللہ کا ارشاد ہے: جب میں پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں"۔ یہی الفاظ سورہ ص آیت ۷۲ رمیں دہرائے گئے ہیں۔ جب اللہ رب العزت نے آدم کے قالب میں اپنی روح میں سے کچھ پھونکا تو اس قالب میں حیات یعنی زندگی پیدا ہو گئی۔ اس کے اندر ارادہ و اختیار اور علم کی تمام صفات پیدا کی گئیں۔ یہ صفات کسی نہ کسی درجے میں صفاتِ الٰہی کا عکس یا پرتو ہیں اور غالباً اس سب کے مجموعے کو 'روح' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس بارے میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سورۂ سجدہ، حاشیہ ۱۶ رمیں رقم طراز ہیں۔

> روح سے مراد محض زندگی نہیں ہے، جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بل کہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی، صاحب اَنا پرستی اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔ اس روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی مِلک ہے اور اس کی ذات پاک کی طرف اس کا انتساب اسی طرح کا ہے، جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بل کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے۔ اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے اور اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۴۱)

یہی وہ روح ہے جسے موت کے وقت فرشتے کسی انسان کے جسم سے نکال لے جاتے ہیں۔ یہ روح انسان کے قالب میں اللہ تعالیٰ نے پھونکی۔ اس کی تفصیلات کے بارے میں قرآنِ حکیم خاموش ہے۔ غالباً یہ کام بھی حکم ربی 'کن' کے تحت ہی انجام پایا۔ واللہ اعلم!

## حضرت حوا کی تخلیق

حضرت آدم کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ان کی زوج حضرت حوا کی تخلیق بھی اللہ رب العزت نے فرمائی۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں ہے کہ تم کو (انسان کو) ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی جان سے اُس کا جوڑا بنایا۔ یہی بات سورۃ الزمر آیت ۶ رمیں بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف آیت ۱۸۹ رمیں یوں بیان ہوا ہے: وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ حضرت حوا کو کس طرح تخلیق کیا گیا، اس کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ انجیل میں اتنی بات بیان ہوئی ہے کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔ تلمود میں اتنا اضافہ مزید ہے کہ حوا کو آدم کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ واللہ اعلم! بہرحال یہ حقیقت ہے کہ حضرت آدم و حوا ایک دوسرے کے لیے سکون کا ذریعہ اور کرۂ ارض

پر نسل انسانی کی افزایش کی بنیاد تھے۔

## فرشتوں اور جنات کو سجدے کا حکم

سورۂ بقرہ آیت ۳۴ رمیں ہے: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا''۔ سورۂ اعراف آیت ۱۱ رمیں یہی حکم ہے: ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو، مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری کئی آیات میں وہ منظر واضح ہوتا ہے، جب اللہ رب العزت نے فرشتوں اور جنوں کو حکم صادر کیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ شرعی سجدہ تو صرف اللہ ہی کو مستلزم ہے۔ یہ بھی شرعی سجدہ تھا۔ اس لیے کہ یہ بھی اللہ ہی کا حکم تھا۔ اس کا مقصد فرشتوں اور جنوں میں انسان (آدم وحوا) کی عزت افزائی اور شرف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کو کائنات کی تمام اشیا کا علم سکھایا (وعلم آدم الأسماء کلھا-البقرہ) اس طرح فرشتوں اور جنات پر فوقیت دی۔ سجدہ کروانے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا، لہٰذا فرشتوں اور جنات کو یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ زمین پر انسان سے مکمل تعاون کیا جائے، سدِّ راہ نہ بنا جائے۔

> زمین کا اپنی بے حد وحساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔

## سجدے کی حکم عدولی

قرآن حکیم میں جس جس مقام پر فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں بالعموم ابلیس یا شیاطین کے ایک گروہ کی سجدے کے حکم کی حکم عدولی بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف آیات ۱۲-۱۸، سورۂ حجر آیات ۲۶-۳۳، سورۂ ص آیات ۷۱-۷۲ ر میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ یہاں صرف سورۂ اعراف کا بیان دیا جارہا ہے۔ پوچھا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا، جب کہ میں نے حکم دیا تھا؟ بولا: میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے نیچے اُتر، تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔ بولا: مجھے اس دن تک مہلت دے، جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: تجھے مہلت ہے۔ بولا: اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا: نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت اُن سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۲-۱۸)

ابلیس نے اپنے آگ سے تخلیق ہونے پر بڑائی دکھائی اور نہ صرف اللہ رب العزت پر الزام تراشی بھی کی کہ ”تو نے مجھے گم راہی میں مبتلا کیا ہے“ حالاں کہ وہ خود اپنے نفس کی گم راہی میں مبتلا ہوگیا تھا اور اللہ کی اطاعت سے نکل گیا اور ذلت میں گر گیا۔ اس بنا پر اللہ احکم الحاکمین نے اُس کو اور اس کے گروہ کو نیچے زمین پر اُتر جانے کا حکم دیا۔ اس انتباہ کے ساتھ کہ ”یقین رکھ کہ ان (انسانوں) میں سے جو تیری پیروی کریں گے تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا“۔

جنات کون ہیں؟ کرۂ ارضی پر جنات بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کو اللہ نے آگ کی لپٹ سے، انسان کی تخلیق سے بہت پہلے پیدا کیا۔ جن انسانوں کو نظر نہیں آتے مگر وہ ان کو دیکھتے ہیں۔ یہ انسانی آبادیوں سے دُور سنسان جگہوں پر رہتے ہیں۔ بعض جنات اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض اللہ اور اس کے احکامات سے رُوگردان بھی ہیں۔ یہ دوسرا گروہ ہے جو اللہ کے سیدھے راستے سے انسانوں کو روکتا ہے اور دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اس گروہ کے افراد شیطان کہلاتے ہیں۔

## آدم و حوا، جنت میں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے منصوبے کے مطابق سجدے کی تقریب کے اختتام پر آدم وحوا کو جنت میں قیام کا اذن عام دیا: اور اے آدمؑ، تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے“ (اعراف ۷:۱۹)۔ یہی بات سورۂ بقرہ آیت ۳۵ ر میں ملتی جلتی آیات میں فرمائی گئی ہے۔ سورۂ طٰہٰ آیات ۱۱۶-۱۱۷ ر میں مزید کہا گیا: یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب سجدے میں گر گئے مگر ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم سے کہا: دیکھو یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تمھیں یہ آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمھیں ستاتی ہے۔ آخر کار دونوں (میاں بیوی) اُس درخت کا پھل کھا گئے۔

ابلیس، آدم کی گھات میں تھا۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے وہ آدم وحوا دونوں کو پھسلانے میں کام یاب ہوگیا کہ: تمھارے رب نے تمھیں جو اس درخت سے روکا ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے اور اُس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ آخر کار دونوں کو دھوکا دے کر اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انھیں پکارا: کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟ دونوں بول اُٹھے: اے رب! ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے (سورۂ اعراف ۲۰-۲۳)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، تمھارے لیے ایک خاص مدت تک زمین میں ہی جائے قرار ہے اور سامانِ زیست ہے اور فرمایا: وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اس میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا (سورۂ اعراف ۲۴-۲۵)

## آدم و حوا اور ابلیس کا زمین پر اُتارا جانا

اللہ احکم الحاکمین نے آدم و حوا اور شیطان کو جنت سے کرۂ ارضی سے اُتر جانے کا حکم صادر کیا اور پھر وہ لوگ زمین پر اُتار دیے گئے اس تنبیہ کے ساتھ ''تمھارے بعض بعض کے دشمن ہیں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ) اور اس ہدایت کے ساتھ کہ جب تمھیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری اس ہدایت پر چلا، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنھوں نے میری آیات کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرہ ۲۸-۲۹)

حکم عدولی کے نتیجے میں ان کے ستر ڈھانکنے کا جو انتظام کیا تھا وہ بکھر گیا۔ اب جنت کے درختوں کے پتوں سے انھوں نے اپنی ستر پوشی کی۔ یہ واقعہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ انسان جب بھی کسی معاملے میں اللہ رب العزت کے حکم کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر اس کا پردہ کھل کر رہے گا۔ انسان کے ساتھ اللہ کی تائید و حمایت اس وقت تک ہے جب تک وہ اللہ کا مطیع فرمان ہے۔ طاعت کی حدود سے قدم باہر نکالتے ہی اُسے اللہ کی تائید و حمایت ہرگز حاصل نہ ہوگی، بل کہ وہ اپنے نفس کے حوالے کردیا جائے گا۔ انسان نے شیطان سے پہلی شکست ستر کے برہنہ ہوجانے کے مسئلے پر کھائی اور آج بھی کارگاہِ حیات میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ شیطان اور اس کی ذُریت کی پوری کوشش ہے کہ مختلف ذرائع استعمال کرکے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے سامنے برہنہ یا نیم برہنہ کردے اور اس کو 'روشن خیالی' یا 'تہذیب جدید' قرار دے کر انسان کو روشن خیال یا ترقی یافتہ ثابت کردے۔

آدم و حوا کو جنت سے نکالا ضرور مگر سزا کے طور پر نہیں بل کہ مزید آزمائش و امتحان کے لیے۔ اس لیے کہ دونوں نے فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کرلی اور اللہ رب العزت سے معافی کے خواست گار ہوئے اور اللہ نے ان دونوں کو معاف بھی کردیا۔ آدم و حوا اپنے رب کی فرماں برداری میں پوری طرح کام یاب نہیں ہوسکے اور انسان کی یہ کم زوری ظاہر ہوگئی کہ وہ اپنے دوست نما دشمن کے فریب میں آکر اطاعت سے رُوگردانی کرسکتا ہے۔ پھر انسان نے عجز و انکسار اختیار کیا اور اللہ کے حضور اپنی بڑائی اور گھمنڈ نہیں دکھایا۔ اس اعتبار سے انسان شیطان سے افضل قرار پایا، جب کہ شیطان نے اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور اللہ رب العزت پر الزام تراشی بھی کی۔

## زمین کی آرایش و زیبایش

کرۂ ارض کو انسان کی رہائش کے قابل بنانا بھی انسان کی تخلیق کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ انسان کی تخلیق سے بہت پہلے یہ کام شروع ہو چکا تھا۔ سورۂ حج آیت ۶۲ / بتاتی ہے: کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس (اللہ) نے وہ سب کچھ تمھارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۵۳ / بیان کرتی ہے: ہم نے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمھارے لیے راستے بنائے اور اُوپر سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے قسم قسم کی پیداوار نکالی۔ سورۂ زمر آیت ۶ / بتاتی ہے: اُس (اللہ) نے تمھارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر اور مادہ پیدا کیے۔ اور سورۂ نمل آیت ۶۱ / میں کہا گیا ہے: اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں؟

یہاں مولانا مودودیؒ کا یہ طویل اقتباس شافی ہوگا:

زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے۔ کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے، مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، جس کے خطرناک نتائج کا اندازہ ہم کبھی زلزلہ آجانے سے بہ آسانی لگا سکتے ہیں، تو یہاں کوئی بھی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے، جس سے رات اور دن کا اختلاف رُونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی کیوں کہ ایک رُخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی اور دوسرے رُخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کرہ پر ۵۰۰ رمیل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردّا چڑھا دیا گیا ہے، جو شہابوں کی خوف ناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ ۲ رکروڑ شہاب جو ۳۰ رمیل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے۔ یہی سمندروں سے بادل اُٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں (آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ) فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔

اس کُرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا اعظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام اُن اشیا کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لیے اس کُرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔

اس کُرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں، جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سر و سامان مفقود ہوتا ہے، وہاں کی زمین کسی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس کُرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا اعظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام اُن اشیا کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لیے اس کُرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی ہو تو ہوا اور پانی، دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ

زندگی یہاں دشوار ہوجاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہوجاتی، اس کا دباؤ بڑھ جاتا، بخارات آبی کا اُٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہوسکتیں، سردی زیادہ ہوتی، زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے بلکہ کشش ثقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل وحرکت بھی ان کے لیے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں، اس کُرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، جو (انسانی، حیوانی اور نباتاتی) آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو سورج سے اس کو حرارت کم ملتی، سردی بہت زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے اور مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا اور اگر فاصلہ کم ہوتا اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان اُمور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصور کرسکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثے کے نتیجے میں خود بہ خود قائم ہوگئی ہیں اور نہ یہ گمان کرسکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور رُوبہ عمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا یا جن یا نبی وولی یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۵۹۰-۵۹۲)

## کرۂ خاکی پر نسلِ انسانی کی تخلیق

آدم اور حوا کو زمین پر اُتارنے کے بعد اور زمین کو ان کا مامن اور مسکن قرار دینے کے بعد مرد اور عورت کے نطفوں کے ملاپ کو انسان کی پیدائش کا طریقہ قرار دیا۔ یہ طریقہ نسل انسانی کو قائم رکھنے، ترقی دینے اور زمین پر پھیلانے اور بسانے کی غرض سے جاری فرمایا۔ سورۂ مومن آیت ۶۷ میں بیان ہے: وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے۔ اس کی مزید تشریح سورۂ دہر آیت ۲ میں یوں کی گئی کہ: ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا اور مزید یہ کہ اور اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے اور پوتے عطا کیے"۔ (النحل ۷۲)

اس عنوان پر بہت سی اور آیات ہیں مگر درج ذیل قابل غور ہیں۔

(۱) پھر اس کی (انسان کی) نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے" (السجدہ ۷-۹)۔

(۲) پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا، جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی" (اعراف ۱۸۹)۔

(۳) کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں (القیامۃ ۳۷-۳۹)۔ مرد اور عورت کے ملنے والے نطفوں سے انسان کے بنانے کی تفصیل سورۂ حج ۵-۶ میں درج ہے۔

انسان کی تخلیق اوّل سے قبل اس کرۂ خاکی پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری اور بھی زندہ مخلوق یعنی نباتات اور حیوانات پیدا کی۔ ان کی بعض انواع پیدا بھی کی گئیں اور معدوم بھی کردی گئیں، مگر نوع زوج زوج یعنی نر اور مادہ کی صورت میں پیدا کی گئیں۔

اس لیے کہ ان سب کی نسلی افزائش مقصود تھی۔قرآن حکیم میں اس بارے میں بیان ہے: پاک ہے وہ ذات جس نے تمام اشیا کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس یعنی نوعِ انسانی میں یا ان اشیا میں جن کو یہ جانتے تک نہیں۔(یٰس ۳۶)

کرۂ خاکی پر ہر انسان ایک خاص مدت تک زندگی گزارے گا۔زندگی گزارنے کے لیے اپنے اختیار سے یا تو وہ طریقہ اختیار کرے گا جو اس کے رب نے پیغمبروں کے ذریعے اس تک پہنچایا ہے یا وہ طریقہ اختیار کرے گا جو رب کے بتائے ہوئے طریقے کے بجائے کوئی اور طریقہ ہے۔بس یہی انسان کی مدت ہے اور ہر انسان کے امتحان کی مدت مختلف ہے۔اس مدت کے اختتام پر ہر انسان پر موت واقع ہوگی اور اس کے جسم سے اللہ کی پھونکی جانے والی روح نکال لی جائے گی اور مُردہ جسم سپردِ خاک کر دیا جائے گا۔دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ پھر ایک مدت بعد اسی خاک سے اس کو اپنی اصلی حالت میں اُٹھا کھڑا کیا جائے گا۔فی الحقیقت یہ ہر انسان کی دوسری پیدائش ہے۔اس وقت بھی اسے رب العزت ہی تخلیق فرمائے گا۔اس بارے میں قرآنِ حکیم میں سورۂ نوح آیت ۱۷ر میں یہ شہادت موجود ہے: پھر وہ (اللہ) تمھیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکا یک تم کو نکال کھڑا کرے گا۔سورۂ طٰہٰ، آیت ۵۵ر میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکال لیں گے۔

...

# کارپس قران کیم: مستشرقین کا قرآن مجید پر حالیہ نقد ونظر

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی
(اعزازی ڈائرکٹر کے۔اے۔نظامی مرکزعلوم القرآن)

**استشراق کی روایت: تاریخی پس منظر اور ارتقاء**

مغرب میں استشراق (Orientalism) یعنی عالم مشرق پر نقد ونظر کی روایت صدیوں قدیم ہے۔اس کی اساس محمدؐ رسول اللہ کے گویا معاصر ساتویں/آٹھویں صدی کے عیسائی عالم دین یوحنا دمشقی (John of Damascus) کے ان مراسلوں پر ہے جو اس نے یوروپ کے ارباب کلیسا کو روانہ کئے(۱)۔ ہر چند کہ یوحنا اموی دربار سے بھی وابستہ تھے اور مسلمانوں بشمول صحابہ کرامؓ سے ان کا براہ راست ربط ضبط تھا، اپنے مراسلات کے ذریعے انھوں نے اہل مغرب کے دل و دماغ پر اسلام/قرآن مجید/سیرت طیبہ سے متعلق یہ نقوش مرتسم کئے: اسلام عیسائیت کی مضحکہ خیز نقل ہے، قرآن مجید بائبل کا ناقص چربہ اور سرقہ ہے، محمدؐ رسول اللہ ایک طالع آزما شخص تھے جنھوں نے عربوں میں اپنے تشخص کا شعور بیدار کیا، ان کو قتل اور غارت گری کے ذریعے ارد گرد کے علاقوں کو تاراج کرنے، مال اور دولت لوٹنے، ان علاقوں پر اپنا قبضہ جمانے اور ان کے باشندوں کو بزور شمشیر اسلام قبول کرنے کے لئے سرگرم کیا اور اس طرح وہ سیاسی قیادت پر قابض ہو گئے (۲)۔ ۶۳۷ء میں عیسائیوں کے مقدس ترین مقام بیت المقدس، یروشلم پر مسلمانوں کی فتح کے بعد اہل مغرب کا اسلام کے خلاف بغض وعناد صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ء تا ۱۲۹۱ء) کی شکل میں عملی طور پر ظاہر ہوا۔ اسلام اور اس کے تمام متعلقات کے خلاف انتہائی تنفر، تمسخر اور تکذیب کے آئینہ دار بالخصوص یہ ہیں: مغربی عوامی گیتوں (Chanson de Geste)، رزمیہ نظموں اور ڈراموں، اطالوی شاعر دانتے (Dante) کی رزمیہ نظم (۱۳۲۱ء) The Divine Comedy، پیٹر دی وینیریبل (Peter the Venerable) (م:۱۱۵۶ء) کے اسلام سے متعلق مجموعۂ تصانیف Corpus Toletanum، عیسائی عالم الٰہیات Thomas Aquinas ٹامس ایکوانس (م:۱۲۷۴ء) کی کلامی اور فلسفیانہ تحریروں، عیسائی پروٹسنٹ فرقے کے بانی مارٹن لوتھر (Martin Luther ۱۴۸۳ء-۱۵۴۶ء) کی ہفوات، الحاد پرست فلسفی اور ڈرامہ نگار ولٹیئر (Voltaire ۱۶۹۴ء-۱۷۷۸ء) کے قابل نفریں ڈرامے ۱۷۳۶ (Mahomet ء)، یہودی عالم دین ابراہام گائیگر Abraham Geiger (۱۸۱۰ء-۱۸۷۴ء) کی رجحان ساز تصنیف Mohammed aus dem Judenthume Aufgenommen (محمد نے یہودیت سے کیا کیا مستعار لیا؟) اور اسی کا پرتو کلیسا سے وابستہ صاحب قلم رچرڈ بیل (۱۸۷۶ء-۱۹۵۲ء) Richard Bell کی کتاب The Origin of Islam in its Christian Environment (عیسائی روایات کا پروردہ مذہب اسلام) (۱۹۲۵ء)، جرمن محقق تھیوڈر نولدیکی ۱۸۳۶ء-۱۹۳۰ء (Theodore Noldeke) کی جمع اور تدوین قرآن مجید پر اعتراضات سے پُر Geschichte des Qurans (۱۹۵۹ء)، برطانوی ماہر لسانیات آرتھر

جیفرے ۱۸۵۹ء-۱۸۹۲ء (Arthur Jeffrey) کی تحقیق انیق The Foreign Vocabulary of the Quran (قرآن کا ذخیرۂ الفاظ غیر زبانوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۸ء)، ۱۵۴۳ء سے اب تک لاطینی، اطالوی، المانوی، فرانسیسی، انگریزی، ولندیزی، روسی اور دیگر مغربی زبانوں میں تراجم قرآن مجید وغیرہ۔

قرآن مجید پر شائع مستشرقین کی صدہا تصانیف میں تواتر کے ساتھ ان اتہامات کا بظاہر علمی تحقیق کے نام پر اعادہ کیا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ:

☆ قرآن مجید یہودیت، عیسائیت اور دیگر مذہبی روایات سے ماخوذ ہے۔

☆ قرآن مجید کا تصور آخرت زرتشتی عقیدے کا عکاس ہے۔

☆ قرآن مجید محمدؐ رسول اللہ کی تصنیف ہے اور وحی الٰہی کی کوئی اصل نہیں ہے۔

☆ مصحف قرآن مجید کی تاریخ جمع اور تدوین مشکوک اور غیر معتبر ہے۔ متن قرآنی محفوظ نہیں ہے۔ اس میں ترمیم، حذف اور اضافے کثرت سے دور عثمانؓ تک ہوتے رہے۔ مصحف کے متعدد اختلافی نسخے تھے اور متن کے بارے میں صحابہ کرام میں شدید اختلافات تھے۔ اصل متن کا معتد بہ حصہ تلف ہو چکا ہے اور غیر قرآنی الحاقی مواد شامل ہو چکا ہے۔

☆ قرآن مجید کی ترتیب بے معنی اور غیر منطقی ہے۔ اسے نزولی رتاریخی اعتبار سے از سر نو مرتب کرنا چاہیے۔

☆ قرآن مجید کا متن ناسخ اور منسوخ آیات کے پیش نظر غیر مصدقہ اور ناقابل اعتبار ہے۔ اصل متن تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔

☆ متن قرآن مجید میں جا بجا صرفی اور نحوی اسقام ہیں۔

☆ غیر مسلم مخبرین اور کاہنوں نے جو بھی روایات رسول کو سنائیں، وہی متن قرآنی کی اساس ہیں۔

☆ قرآن مجید میں معرب الفاظ کثرت سے ہیں، بالخصوص سریانی حبشی اور عبرانی زبانوں کے۔

☆ قرآن مجید میں مذکور حروف مقطعات چیستاں ہیں جن کے معنی آج تک طے نہیں ہو پائے ہیں۔

☆ قرآن مجید جاہلی شاعری سے مستعار ہے۔

☆ قرآنی عقائد اور تعلیمات ظالمانہ اور جابرانہ ہیں اور فرد کی آزادی پر قدغن عائد کرتی ہیں۔

☆ متعدد قرآنی الفاظ کی قراءت میں اختلافات ہیں جس سے معنی اور مفہوم متاثر ہوتے ہیں۔

☆ قرآن مجید کے متن میں معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) کی شمولیت ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ بعض صحابہ کرام کو اس باب میں شرح صدر نہیں تھا۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہر دور کے مسلم فضلاء نے ان بے بنیاد الزامات کا علمی تعاقب کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں محمد مصطفی الاعظمی (۲۰۰۳ء) اور موہر علی (۲۰۰۴ء) نے اپنی وقیع انگریزی تصانیف کے ذریعے اس فتنے کا استیصال کیا ہے(۳)۔

قرآن مجید کے بارے میں ترمیم پسند اور استشراق نو کا حالیہ مکتبۂ فکر ۱۹۸۰ء (Neo-Revisionist/Orientalist) سے مطالعۂ قرآن مجید کے باب میں ایک نیا اور زیادہ شرانگیز مکتب فکر مقبول ہوا ہے، جس کا موقف کسی عجوبے سے کم نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مطالعۂ قرآنیات پر کئی عشروں سے اسی مکتب فکر کا غلبہ ہے اور اس کے علمبردار مغربی جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات اور قرآنیات کے سربراہ ہیں، ان کی فتنہ پرور تصانیف نصاب میں داخل ہیں اور ان ہی کے مفروضات پر درجنوں تحقیقی مقالے منصہ شہود پر آ چکے ہیں۔ اس مکتب فکر کے مزعومات ایک نئی طلسم ہوش ربا کے ابواب ہیں اور اس مصرعے کے مصداق:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے !

لندن یونیورسٹی

اس مکتب فکر کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ کوئی مسلم ماخذ قابل اعتماد نہیں لہذا تفسیر، حدیث، آثار اور روایات کا سارا سرمایہ درکنار کرتے ہوئے اس دور کے غیر مسلم ماخذ، روایات، ثقافت، آثاریات، علم کتبہ شناسی، خطاطی، علم مسکوکات وغیرہ پر انحصار کرتے ہوئے جو خاکہ سامنے آئے صرف اسے ہی اسلام تسلیم کیا جائے۔ اس مکتب فکر کے سرخیل لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے استاد جان وانسبرا ۱۹۲۸ء-۲۰۰۲ء (John Wansborough) ہوئے ہیں ان کی تصانیف رفکر کے پس پشت ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلم مآخذ مبالغہ آمیز ہیں، وہ تاریخ نہیں بلکہ مذہبی جوش کے مظاہر ہیں جو قابل اعتناء نہیں ہیں۔ وانسبرا کے فکری ماخذ یہ مستشرقین ہیں: اگناز گولڈزیہر ۱۸۵۰ء-۱۹۲۱ء (Ignaz Goldziner) اور جوزف شاخت ۱۹۰۲ء-۱۹۶۹ء (Joseph Schacht)، جن کے مطابق کل سرمایۂ حدیث جعلی اور صدیوں بعد وضع کیا ہوا ہے۔ اسی مفروضے سے متاثر وانسبرا اور ان کے سعید شاگرد اینڈریو رپن ۱۹۵۰ء-۲۰۱۶ء (Andrew Rippin) اور دیگر مستشرقین نے اسلام اور اس کی کل تاریخ کو منہدم کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

☆ قرآن مجید کا جغرافیائی اور ثقافتی محل وقوع حجاز نہیں بلکہ عراق اور شام کی تاریخ اور تمدن ہے۔

☆ قرآن مجید کے اجزاء صرف زبانی روایت پر مشتمل تھے، ان کو آٹھویں صدی کے آخر میں مرتب کیا گیا، گویا وفات نبوی کے ڈیڑھ سو سال بعد۔

☆ان زبانی روایات کے صرف ایک قلیل حصے کو قرآن مجید سے موسوم کیا گیا، بقیہ احادیث کے طور پر معروف ہیں۔

☆ نویں صدی یعنی وفات نبوی کے دوسو ستر (۲۷۰) سال بعد جب عربی زبان کے اصول صرف ونحو وجود میں آئے مصحف قرآن مجید اور تفاسیر منظر عام پر آئے۔ اس سے قبل ان کا وجود نہیں تھا۔

☆ قرآن مجید یہودیوں سے مخاصمت اور ان پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے تحریر کیا گیا۔ اس کا بیشتر حصہ یہودیوں کے خلاف سب وشتم پر مبنی ہے۔

☆ اسلام کا تصور جہاں، اس کے عقائد، احکام اور تعلیمات بعد کی صدیوں میں متشکل ہوئے البتہ ان کو محمدؐ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا تا کہ ان کو تقدس حاصل ہو اور ان پر عمل درآمد کی تلقین کی جا سکے۔

☆ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کا کوئی مسلم ماخذ موجود نہیں ہے، آج جو موجود ہیں وہ صدیوں بعد وضع کئے گئے۔

دور حاضر کے ترمیم پسند/مستشرقین نو کی محیر العقول آراء کا ذیل میں خلاصہ پیش ہے۔ حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ ان کو مغرب میں درجہ استناد حاصل ہے اور یہ اب استشراق کی روایت کے مسلمات میں داخل ہیں۔

(۱) ڈنمارک نژاد فاضلہ پیٹریشیا کرون (Patricia Crone) ۱۹۴۵ء-۲۰۱۵ء کی تحقیق The Making of the Islamic World (۱۹۷۷ء) کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید ساتویں صدی عیسوی/وفات نبوی کے بہت بعد وجود میں آیا، مکہ کوئی مقدس مقام کبھی نہیں رہا، شمال مغرب عرب میں البتہ بعض مقدس مقامات تھے۔ بعد کی صدیوں میں جنگوں میں فتح سے جب مسلمانوں کو سیاسی اقتدار نصیب ہوا، انھوں نے اپنے طور پر اسلام کے خدوخال طے کیے، ہجرت مدینہ محض ایک افسانہ ہے۔ اسلام کی مبینہ ابتدائی صدیوں میں مسلم لفظ تک مستعمل نہ تھا۔

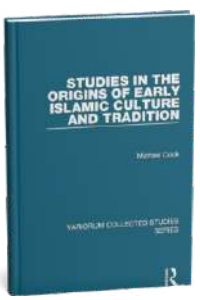


(۲) برطانوی مستشرق مائیکل کُک (Michel Cook) ۱۹۴۰ کی اہم تصنیف ہے: Studies in the Origin of Early Islamic Culture and Tradition (۲۰۰۴) اور سیرۃ طیبہ پر ان کی تصنیف (۱۹۹۶ء)۔ ان کے مطابق مسلمانوں نے قرآن مجید کو مقدس یا شاہکار فرض کر لیا ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس میں غیر عرب لوازمے کی بہتات ہے اور اس پر یہودی اور عیسائی مذہبی روایات کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔

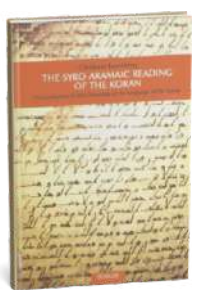


(۳) جرمن نژاد کرسٹوف لکزنبرگ (Christoph Luxenberg) کے قلمی نام سے معروف اس مصنف کی کتاب The Syro-Aramaic Reading of the Koran (۲۰۰۷ء) میں یہ شوشہ چھوڑا گیا ہے کہ قرآن مجید درحقیقت سریانی اور آرامائی زبان میں تحریر ساتویں صدی کے ایک عیسائی صحیفے کا چربہ ہے جب کہ قرآن مجید کی خود اپنی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں عربی زبان کا وجود ہی نہیں تھا صرف سریانی زبان پورے عرب میں رائج تھی۔

(۴) یہودی/اسرائیلی ماہر آثاریات یہودا نیوو(Yehuda Nevo) ۱۹۳۲ء نے آثاریات کے حوالے سے یہ صریحا باطل دعوی کیا ہے کہ نویں صدی عیسوی سے قبل اسلام/قرآن مجید اور مسلمانوں سے متعلق کوئی آثار یاتی ثبوت (کتبے، سکے، عمارات وغیرہ) نہیں ملتے لہذا پہلی اور دوسری صدی ہجری بمطابق ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام/قرآن مجید/سیرۃ طیبہ/مدینہ/صحابہ کرام/مسجد نبوی جیسے تمام اسلامی مظاہر ناپید تھے۔ اس نام نہاد فاضل نے اس بدیہی آثار یاتی شہادت کو نظرانداز کر دیا ہے کہ قبۃ الصخرہ، یروشلم پر اموی دور (۷۱ھ/۶۹۱ء) کا کتبہ، مسجد نبوی پر اموی خلیفہ الولید کا کتبہ اور اسی دور میں مدینہ میں کاتبین قرآن مجید کے مکانات/آثار یاتی شواہد آج تک محفوظ ہیں۔

اس مکتب فکر سے وابستہ مستشرقین کے مزعومات یہ ہیں جن پر حیرت اور عبرت دونوں ہوتی ہے، حیرت جہالت کی انتہا پر اور عبرت حق کی ایسی دیدہ اور دانستہ دشمنی پر۔ اس مکتب فکر کے باطل نظریات یہ ہیں:

> تاریخ کی رو سے قرآن مجید اور ذخیرہ حدیث کا وجود ثابت نہیں۔ اسلام کی ابتداء مکہ میں نہیں بلکہ شام اور روم کی سرحدوں پر کسی نامعلوم مقام پر ہوئی۔ محمدؐ رسول اللہ، صحابہ کرام، مدینہ کی اسلامی ریاست، یہ سب محض افسانے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔ یعنی وفات نبوی کے ایک سو بیس (۱۲۰) سال بعد اسلام کا ظہور ہوا۔ اردن میں واقع شہر البتراء Petra اسلام کا مولد ہے۔ عباسی دور حکومت (۷۵۰ء-۱۲۹۸ء) میں اسلامی سرمایہ علم تصنیف اور مدون ہوا۔ اس سے قبل کسی ماخذ کا سراغ نہیں ملتا۔ شریعت تمام تر اقوال نبیؐ پر مبنی ہے، اس میں قرآن مجید کا کوئی دخل نہیں ہے۔ شریعت کے تمام قوانین اس دور میں خطۂ عرب میں رائج رسوم اور رواج کے عکاس ہیں، ان میں کوئی ندرت نہیں ہے، خطۂ عرب میں زرتشتی اور یہودی مذہبی عقائد کا غلبہ تھا، ان ہی کا اظہار قرآن مجید میں ملتا ہے۔ قرآن مجید کے متن میں حذف واضافے اور ترامیم وفات نبوی کے بعد تک جاری رہیں۔ احادیث وفات نبوی کے ڈیڑھ دو سو سال بعد ضبط تحریر میں آئیں لہذا یہ مطلق نا قابل اعتبار ہیں۔ وضع حدیث کا آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں دور دورہ تھا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسلامی طرز حیات اور عجمی اور بازنطینی ثقافت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اسلامی تشخص کا تصور صدیوں بعد پیدا ہوا۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام، قرآن مجید، رسول اللہ، مکہ، مدینہ، اسلامی ریاست، غزوات، احادیث، سیرۃ طیبہ، صحابہ کرام، شریعت غرضیکہ کسی اسلامی مظہر یا ادارے کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ تخیلات آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں اختراع کئے گئے اور ساتویں صدی عیسوی کے اسلام کی فرضی تاریخ وضع کی گئی۔

ترمیم پسند اور استشراق نو کے مذکورہ بالا مفروضات نا قابل یقین حد تک مضحکہ خیز اور شر انگیز ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے متعلق یہی بظاہر علمی روایت مغرب کے ذہن پر مستولی ہے۔ اس کے علمی تعاقب کی اشد ضرورت ہے۔

**کارپس قرانکیم (سرمایہ قرآنیات): مستشرقین کا تازہ ترین علمی منصوبہ**

۲۰۰۷ء سے اکیڈمی برائے سائنسی اور بشریاتی علوم، برلن، جرمنی میں نہایت وسیع پیمانے پر قرآنیات سے متعلق دورِ حاضر کے

مستشرقین کا علمی منصوبہ جاری ہے اور اس کی تحقیقات انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں (۴)۔ان مغربی فضلاء کے عزائم بڑے بلند و بانگ ہیں۔ان کے پیش نظر سرمایۂ قرآنیات کو محفوظ کرنا اور اس پر محاکمہ کرنا ہے۔اس منصوبہ کے دائرۂ کار میں قرآن مجید کے اولین مخطوطات اور نزول قرآن مجید کے دور اور اس سے قبل کے تمام متعلقہ لوازمے بالخصوص یہودی، عیسائی زرتشتی اور بحر روم کے پورے علاقے کی مذہبی، اسطوری، ثقافتی اور معاشرتی روایات کا تجزیہ بھی اس زاویہ سے ہے کہ ان سے اسلام رقرآن مجید کسی حد تک متاثر ہے۔مصحف کے اولین نسخوں کو جمع کرنے کے علاوہ ان پر اعراب لگانا اور ان نسخوں کی Carbon Dating (سائنسی طریقۂ کار سے کسی شے کا زمانہ متعین کرنے کا عمل) اس منصوبے کا حصہ ہیں (۵)۔قرآن مجید کا تحقیقی اور تنقیدی ایڈیشن اور اس پر مبسوط تفسیر بھی ایک اہم مقصد ہے۔اب تک ہزار ہا قدیم دستاویزات کو مدون کیا گیا ہے۔اس منصوبے کے سربراہ مائیکل مارکس کا یہ قول معنی خیز ہے اور مسلم محققین کی توجہ کا طالب: ''قرآن از خود وجود میں نہیں آیا۔ساتویں صدی عیسوی میں حجاز عظیم بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کے اثرات، عیسائی ادریت اور عرفانیت، قدیم عربی شاعری پر مستولی عینیت پرستی اور یہودی اور عیسائی عقائد اور روایات کی آماجگاہ تھا۔ان اثرات اور محاکات کے حوالے ہی سے قرآن کی تفہیم ممکن ہے۔قرآن کے پہلو بہ پہلو اس دور کے متعدد غیر قرآنی متون بھی ملتے ہیں۔البتہ قرآن محض نقالی یا سرقہ نہیں ہے''۔یہ منصوبہ درحقیقت اوائل بیسویں صدی کے جرمن استشراقی روایت کا تسلسل ہے اور اس کا منہج بنیادی طور پر متنی تنقید ہے۔اس منصوبے کے پس پشت یہ چار نظریہ ساز مستشرقین ہیں: (۱) ابراہام گائیگر (۱۸۱۰ء-۱۸۷۴ء)۔یہ یہودی عالم دین تھے۔جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا، ان کی تصنیف کا عنوان ہے: ''محمد نے یہودیت سے کیا کیا مستعار لیا''۔(۲) رچرڈ بیل (Richard Bell) ۱۸۷۶ء-۱۹۵۲ء اور متعدد دیگر مستشرقین جن کا اصرار ہے کہ قرآن عیسائیت کی ایک ناکام نقل کے سوا کچھ نہیں۔(۳) تیسرے نظریہ ساز مستشرق تھیوڈر نولڈیکی (Theodore Noldeke) ۱۸۳۶ء-۱۹۳۰ء ہیں جن کی تحقیق کی زد میں قرآن مجید کی تاریخ جمع اور تدوین ہے۔ان کے مطابق متن قرآن مجید ہر طرح کی اغلاط سے پُر ہے۔(۴) اس منصوبے کے فضلاء برطانوی مستشرق آرتھر جیفرے (Arthur Jeffrey) ۱۸۹۲ء-۱۹۵۹ء کے خوشہ چیں ہیں، ان کی دانست میں قرآن مجید کا ذخیرہ الفاظ دیگر زبانوں سے مستعار ہے۔

ان بنیاد گزار محققین کے قرآن مجید مخالف نظریات کی اساس پر یہ علمی منصوبہ ان مراحل کو طے کر رہا ہے:

(i) قرآنی مخطوطات کا بالاستیعاب تنقیدی مطالعہ
(ii) قرآن مجید کے اولین نسخوں میں اختلافات کی نشاندہی
(iii) نزول قرآن مجید سے ماقبل اور اس دور کے متون سے قرآن مجید کا موازنہ تاکہ ان کے اثرات کو قرآنی متن پر ثابت کیا جائے۔
(iv) متن قرآن مجید پر مستشرقانہ ذہن کی غماز مبسوط تفسیر۔

فری یونیورسٹی، برلن

زیرنظر مقالے میں صرف ایک قرآنی سورہ الاسراء پر تفسیر کا تجزیہ پیش ہے(٦)۔اس سے قارئین کو اس علمی منصوبے سے وابستہ مستشرقین کے تعصبات،مزعومات اور ذہنی تحفظات کا علم ہوگا۔ ہر چندکہ اس منصوبے کی روح رواں فری یونیورسٹی،برلن،جرمنی میں عربی مطالعات کی خاتون پروفیسر انجیلکا نیورتھ Angelika Neuwirth ہیں،سورہ الاسراء پر تفسیر میں ان کے شریک کا رڈرک ہارٹ وگ ہیں جو اسی اکیڈمی سے وابستہ ہیں انھوں نے اسلام کے علاوہ یہودیت کا مطالعہ یروشلم میں کیا ہے،ان کا قیام عالم اسلام میں بھی رہا ہے۔ان کا شعبۂ اختصاص مطالعۂ یہودیت اور قرآن مجید ہے۔جس کا نمایاں اثر زیر مطالعہ تفسیری حواشی میں عیاں ہے۔ان تفسیری حواشی میں ان مستشرقین نے جوگل کھلائے ہیں،ان پر نقد ونظر ذیل میں پیش ہے کہ کس کس پہلو سے قرآن مجید کا استخفاف کیا گیا ہے۔

(۱) سورہ الاسراء آیت-۱:سُبۡحَانَ الَّذِی أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ إِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡأَقۡصَى (پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا) کے بارے میں ان فضلاء کا قول فیصل ہے کہ اس آیت میں بائبل کی کتاب حزقی ایل کی بازگشت ہے(۷)۔بائبل کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

> تیسویں برس کے چوتھے مہینے کی پانچویں تاریخ کو یوں ہوا کہ جب میں نہر کبار کے کنارے پر اسیروں کے درمیان تھا تو آسمان کھل گیا اور میں نے خدا کی رویتیں دیکھیں......اور میں نے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ شمال سے آندھی اٹھی اور ایک بڑی گھٹا اور لپٹتی ہوئی آگ اور اس کے گرد روشنی چمکتی تھی اور اس کے بیچ میں سے یعنی اس آگ میں صیقل کئے ہوئے پیتل کی سی صورت جلوہ گر ہوئی......اس کی کمر سے لے کر نیچے تک میں نے شعلہ کی سی تجلی دیکھی اور اس کے چاروں طرف جگمگاہٹ تھی ......یہ خداوند کے جلال کا اظہار تھا اور اس نے مجھ سے کہا اے آدم زاد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو تا کہ میں تجھ سے باتیں کروں جب اس نے مجھ سے یوں کہا تو روح مجھ میں داخل ہوئی اور پاؤں پر مجھے کھڑا کیا۔تب میں نے اس کی سنی جو مجھ سے باتیں کرتا تھا۔(حزقی ایل ۱:۱-۵اور ۲۷ اور ۲:۱-۲،ص ص ۷۷۸،۷۷۹)(۸)

قرآن مجید اور بائبل کے اقتباسات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔قرآن مجید میں نہ ذکر دیدار الٰہی ہے،نہ خدا سے ہم کلامی کا اور نہ تجسیم خداوندی کا۔قرآن مجید میں محض ایک واقعہ بیان کیا گیا اور نسبت تمام تر رب العالمین اور اس کے ایک بندے کے مابین ہے۔بائبل کی طول طویل عبارت حزقی ایل نبی کی رویت الٰہی اور خدا سے ہم کلامی اور خدا کی شبیہ گری کے بارے میں ہے۔بائبل کے مطابق چھٹی صدی عیسوی قبل مسیح کے اس نبی کو ’خدا کے رتھ‘‘ کو برائے العین دیکھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی تھی جسے

> چار محیر العقول جاندار اٹھائے ہوئے تھے،ان میں سے ہر جاندار کے چار چار چہرے تھے:ایک انسان کا،دوسرا شیر ببر کا،تیسرا

سانڈ اور چوتھا عقاب کا۔ان کے پر بھی تھے اور صورت آگ کے سلگتے ہوئے کوئلوں اور مشعلوں کی مانند تھی۔ان چاروں کے حلقوں کے گرداگرد آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔ان کے پیروں کی آواز گویا بڑے سیلاب کی آواز یعنی قادرِ مطلق کی آواز۔(حزقی ایل ۱:۴-۲۷،ص ص ۷۷۸-۷۷۹)

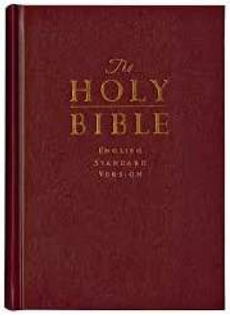



بائبل اور قرآن مجید کے اقتباسات کے اس موازنے کی روشنی میں ان مستشرقین کا قرآن مجید پر حرف گیری ان کی کور چشمی کی دلیل ہے۔

(۲) آیت :۱ میں لفظ ''اسریٰ'' (رات میں لے جانا) آیا ہے۔سورہ طٰہٰ ۲۰:۷۷، الشعراء ۲۶:۵۲ اور الدخان ۴۴:۲۳ میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا اور ان تینوں مقامات میں موسیٰ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ رات ہی میں بنی اسرائیل کو لے کر نکل جائیں تاکہ فرعون کے جبر اور استبداد سے نجات پائیں۔کھلا ہوا اشارہ خروج بنی اسرائیل سے متعلق ہے۔محض اس لفظی یکسانیت (یعنی لفظ ''اسریٰ'' کے کے استعمال) کی بنیاد پر مستشرقین نے یہ افسانہ تراشا ہے کہ سورہ الاسراء میں رات کے سفر معراج کا واقعہ موسیٰؑ سے متعلق ہے،اس مفروضے سے وہ ایسے مغلوب ہیں کہ وہ ''اسریٰ'' سے عین متصل متعلقہ متعین مقامات مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ کو قطعاً فراموش کر دیتے ہیں۔مسجد الحرام سے موسیٰ کو کوئی نسبت نہ تھی،اس کو بھی مطلق نظر انداز کر دیتے ہیں (۹)۔ترمیم پسند مکتبۂ فکر کے بنیاد گزار مستشرق جان وانسبرا (John Wansbrough) ۱۹۲۸ء-۲۰۰۲ء نے قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے معراج کے واقعہ کو موسیٰؑ سے منسوب کیا ہے(۱۰)۔اسی کا تتبع اس تفسیر میں بھی ہے۔ان کے مطابق اس سورہ کا صحیح عنوان ''خروج'' ہے کہ یہ اسی واقعے سے متعلق ہے۔ان کی دانست میں المسجد الحرام کا تعلق مکہ رکعبہ سے اس لئے مشکوک ہے کہ قرآن مجید میں کعبہ کے لئے معروف لفظ ''البیت'' ہے چونکہ وہ استعمال نہیں ہوا ہے لہٰذا کعبہ مراد نہیں ہے۔ان کے مطابق المسجد الحرام مترادف ہے ''خداوند کے مسکن'' (بیت المقدس) کا جس کا ذکر بائبل کی کتاب حزقی ایل (۳:۱۳) میں ہے جبکہ ''مسجد الاقصیٰ'' ایک نامعلوم دور دراز مقام کا نام ہے۔اس غیر منطقی طرز استدلال اور صریح حقائق سے چشم پوشی پر صرف حیرت اور تاسف کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ کتمان حق میں عقل پر کیسے پردے پڑ جاتے ہیں۔

(۳) آیت :۱ کا ایک جزو ہے:الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ. (مسجد اقصیٰ جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے)۔ان فضلاء کے مطابق یروشلم کے بابرکت ہونے کا تصور یہودی روایت سے مستعار ہے (۱۱)۔یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے تخلیق کے عمل کی ابتداء یروشلم شہر کی تعمیر سے کی اور بتدریج اس ہی کی برکات سے دیگر مقامات یا یہ دنیا وجود میں آئی۔یہودی تفسیر بائبل موسوم بہ مدراش (Midrash Tanchuma) کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

مسجد اقصیٰ

''میں (خدا) نے باغ بنائے اور ان میں طرح طرح کے ثمر آور درخت لگائے۔ جس طرح انسانی جسم کے عین وسط میں ناف ہوتی ہے، ارض اسرائیل دنیا کی ناف ہے۔ یہ دنیا کے عین وسط میں واقع ہے اور ارض اسرائیل کے قلب میں یروشلم واقع ہے اور اس کے وسط میں مقدس ہیکل اور اس کے صدر میں وہ خیمہ جس میں عہد نامہ عتیق ایک صندوق میں محفوظ ہے''۔(۱۲)

یروشلم کے اس تقدس سے محمد رسول اللہ کا کوئی ناطہ رشتہ نہیں تھا لہذا اس قرآنی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ''اسری'' کا واقعہ موسیٰ سے متعلق ہے نہ کہ رسول عرب سے۔

اس باطل استدلال میں بھی خلط مبحث ہے۔ انبیائے کرام کا مسکن اور مدفن ہونے کے باعث بیت المقدس، یروشلم کا شمار اسلامی مقامات مقدسہ میں ہوتا ہے، البتہ اس آیت میں ذکر ہے کہ اللہ محمدؐ رسول اللہ کو کعبہ سے بیت المقدس راتوں رات لے گیا۔ یہاں یروشلم کے تقدس کے ذکر سے آپ کے سفر معراج کی نفی نہیں ہوتی البتہ ان فضلاء کے پیش نظر صرف یہ مفروضہ ہے کہ اسراء/معراج کا واقعہ موسیٰ کو پیش آیا اور اسلامی روایت میں اسے غلطی سے محمد رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

اسلام/عرب دشمنی کا یہ پہلو بھی سبق آموز ہے کہ اپنے جد اعلیٰ ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ اولین بیت اللہ، کعبہ سے یہودیوں کی بے اعتنائی کیسی شدید ہے۔ اسی کے پہلو بہ پہلو اپنی قومی، سیاسی تاریخ کے مظہر یروشلم کے مجد و شرف کے بارے میں کیسے غلو کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۴) بائبل کتاب حزقی ایل میں مذکور ہے کہ نبی حزقی ایل کو ان کے گھر سے آگ کی مانند ایک شبیہ نے ان کو پکڑا اور پھر روح نے ان کو آسمان اور زمین کے درمیان بلند کیا اور ان کو رویائے الٰہی میں یروشلم لے آئی اور وہ اسرائیل کے خدا کے جلال کے روبرو ہوئے۔ (حزقی ایل ۸:۱-۵ ص ص ۷۸۴)

زیر مطالعہ تفسیر کی رو سے مذکورہ بالا روایت سورہ الاسراء کی آیت -۱: سُبْحَانَ الَّذِی أَسْرَیٰ بِعَبْدِهِ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصَی الَّذِی بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِیَهُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِیعُ الْبَصِیرُ (پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے) کی اساس ہے۔ دونوں اقتباسات میں مشترک کچھ بھی نہیں پھر بھی ان فضلاء کی یہ جسارت حیرت انگیز ہے۔

(۵) ان فضلاء کا یہ فتویٰ ہے کہ پوری کی پوری سورہ الاسراء موسیٰؑ پر مرکوز ہے (۱۳) جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۱۱/آیات پر مشتمل اس سورہ کی صرف ۱۱/آیات (۲ تا ۸ اور ۱۰۱ تا ۱۰۴) موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے متعلق ہیں جب کہ بقیہ ۱۰۰/آیات کے موضوعات متعدد اور متنوع ہیں (اللہ کی نشانیاں، معذب قوموں کے بارے میں سنت الٰہی، عقائد اور اعمال کے بارے میں متعدد احکام، اثبات توحید، مشرکین کا انکار حق اور قرآن مجید اور آخرت کی تکذیب، قوم ثمود، ابلیس کی سرکشی، انعام الٰہی بتکریم بنی آدم، منظر آخرت، نماز اور تلاوت کی تاکید، محمدؐ رسول اللہ کے لئے مقام محمود کی بشارت، روح، معجزہ قرآن مجید، مشرکین کا حسی اور مادی معجزات کا مطالبہ،

قرآن مجید کی بتدریج تنزیل اور صفات الٰہی وغیرہ)۔قرآن مجید کا یہودیت سے ماخوذ ہونے کا خیال ان فضلاء کے قلب اور ذہن پر ایسا مستولی ہے کہ انھیں امر واقعہ کے انکار میں بھی کوئی باک نہیں۔

(۶) سورہ الاسراء آیات قرآنی ۱۳/اور ۱۴/ یہ ہیں: وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا۔اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا.(ہم نے ہر انسان کی برائی بھلائی کو اس کے گلے لگا دیا ہے اور بروز قیامت ہم اس کے سامنے اس کا نامۂ اعمال نکالیں گے جسے وہ اپنے اوپر کھلا ہوا پالے گا۔ لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے۔آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے۔)

ان فضلاء کے مطابق تقدیر اور انسان کی آزادیٔ عمل دو متضاد تصورات ہیں اور وہ ایک دوسرے کے منافی ہیں لہذا یہ قرآنی موقف معنی سے عاری ہے(۱۴)۔یہ الزام بھی ایک بدیہی حقیقت کا بطلان ہے۔أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ.سے مراد ہے کہ اللہ نے خیر وشر کے راستے ہر انسان کے سامنے بالکل واضح کر دیے ہیں اور اپنے اعمال کی بناء پر وہ ثواب اور عذاب کا مستحق ہوگا۔ایسے منطقی اور مدلل بیان کو متناقض قرار دینا محض شر انگیزی اور مخالفت حق ہے ورنہ قرآنی موقف قطعاً غیر مبہم اور عام فہم ہے۔

(۷) سورۃ الاسراء آیات ۲۲ تا ۳۹ میں متعدد احکام الٰہی وارد ہوئے ہیں۔ان فضلاء کا پہلا اور مہمل اعتراض یہ ہے کہ اس سے قبل نازل قرآن مجید میں کوئی حکم نہیں ملتا، یک بہ یک بغیر کسی تمہید کے ان آیات میں اللہ بطور شارع نظر آتا ہے(۱۵)۔اللہ رب العالمین کی اس حیثیت پر اعتراض طفلانہ بھی ہے اور مضحکہ خیز بھی۔ان کا دوسرا اعتراض اور زیادہ شدید اور سنگین ہے۔ان کے بقول یہ قرآنی احکام توریت کی کتاب خروج میں مذکور ان احکام عشرہ کی ناقص نقل ہیں جو اللہ نے موسیٰ کو کوہ سینا پر عطا کئے تھے(۱۶)۔

ذیل میں توریت اور قرآن مجید کے احکام نقشے کی شکل میں موازنے کے لئے پیش ہیں:

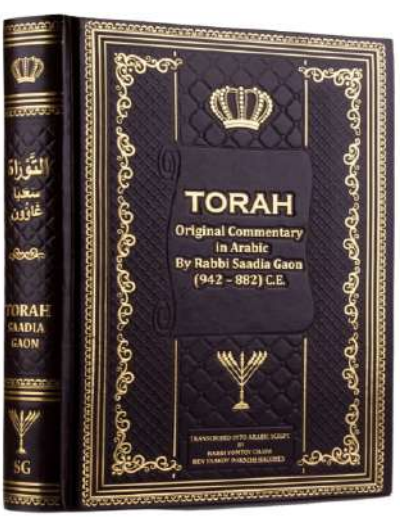


**توریت کے احکام عشرہ**

(۱) میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا(خروج ۲۰:۳)

(۲) تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا(خروج ۲۰:۴-۶)

(۳) تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا(خروج ۲۰:۷)

(۴) یاد کر کے تو سبت کا دن پاک ماننا(خروج ۲۰:۸-۱۱)

(۵) تو اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزت کرنا(خروج ۲۰:۱۲)

(۶) تو خون نہ کرنا(خروج ۲۰:۱۳)

(۷) تو زنا نہ کرنا(خروج ۲۰:۱۴)

(۸) تو چوری نہ کرنا(خروج ۲۰:۱۵)

(۹) تو اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا (خروج ۲۰:۱۶)

(۱۰) تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا (خروج ۲۰:۱۷) (۱۷)

**احکام قرآنی**

(۱) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، نہ اس کے سوا کسی کی عبادت کرو (۱۷:۲۲)

(۲) والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، ان کا احترام بجالاؤ اور ان کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا کرو۔ (۱۷:۲۳-۲۴)

(۳) رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو۔ (۱۷:۲۶)

(۴) اسراف اور فضول خرچی سے پرہیز کرو۔ (۱۷:۲۶-۲۷)

(۵) ضرورت مندوں اور غریبوں سے نرم لہجے میں بات کرو۔ (۱۷:۲۸)

(۶) بخل سے کام نہ لو اور نہ دونوں ہاتھوں سے اپنی دولت لٹاتے رہو۔ (۱۷:۲۹)

(۷) مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (۱۷:۳۱)

(۸) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیوں کہ وہ بڑی بے حیائی ہے۔ (۱۷:۳۲)

(۹) کسی جان کو ناحق ہرگز قتل نہ کرو۔ (۱۷:۳۳)

(۱۰) اپنے مقتول کا قصاص لیتے وقت بھی انصاف کو پیش نظر رکھو۔ (۱۷:۳۳)

(۱۱) یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ (۱۷:۳۴)

(۱۲) وعدے پورے کرو۔ (۱۷:۳۴)

(۱۳) ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو۔ (۱۷:۳۵)

(۱۴) جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو۔ (۱۷:۳۶)

(۱۵) زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ (۱۷:۳۷)

(۱۶) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بناؤ گے تو دوزخ میں ڈال دیے جاؤ گے۔ (۱۷:۳۹) (۱۸)

ان فضلاء کا یہ بھی الزام ہے کہ محمدؐ رسول اللہ نے احکام عشرہ میں سے احکام شمار نمبر ۲، ۳، ۴/اور ۱۰ حذف کر دیے اور ۱۴ احکام کا ازخود اضافہ کر دیا (۱۹)۔ غالباً اس حقیقت کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ کوئی بھی مغربی فاضل قرآن مجید کو منزل من اللہ کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتا اور اس سلسلہ وحی اور پیغمبران خداوندی کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتا جس کے مطابق حالات اور ظروف کی رعایت سے ہر آسمانی کتاب/شرعی احکام میں اللہ حکیم اور عزیز مطلق نے مناسب تبدیلیاں کی۔ اس حقیقت کی تکذیب مذکورہ بالا اعتراض کے پس پشت ہے۔ ان فضلاء میں احکام عشرہ اور احکام قرآنی میں بعض مماثلتوں کو قرآن مجید میں سرقے سے تعبیر کیا ہے کیونکہ وہ اس امر کے منکر ہیں کہ توریت اور قرآن مجید دونوں ہی اللہ کے نازل کردہ ہیں لہذا بعض مقامات میں ان میں مماثلت چنداں حیرت انگیز یا

قابل اعتراض نہیں۔ بہر کیف وہ اپنی اس تحقیق پر بہت نازاں اور فرحاں ہیں کہ سورہ الاسراء میں چند ایسے احکام مذکور ہیں جو توریت میں بھی وارد ہیں مثلاً آیت ۲۶/ بائبل کتاب خروج ۲۲: ۲۱-۲۷۔ اس ضمن میں یہ فضلاء اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ کتاب خروج میں اس سے متصل آیات میں یہ احکام بھی در آئے ہیں:

"تو خدا کو نہ کوسنا اور نہ اپنی قوم کے سردار پر لعنت بھیجنا۔ تو اپنی کثیر پیداوار اور اپنے کولھو کے رس میں سے مجھے نذرونیاز دینے میں دیر نہ کرنا اور اپنے بیٹوں میں سے پہلوٹھے کو مجھے دینا۔ (خروج ۲۲: ۲۸-۲۹ ص ۷۵)

اگر معاذ اللہ قرآن مجید توریت کے احکام کا چربہ ہوتا تو اس میں اس نوع کے غیر فطری احکام کیوں نہیں ہیں (اللہ کو نذرونیاز دینا، اس میں مطلق کوئی تاخیر نہ کرنا اور اپنے پہلے بیٹے کو اللہ کے نام پر وقف کر دینا) یہ توریت میں تحریف پر دال ہیں۔

(۸) والدین کے ساتھ حسن سلوک ایک اہم قرآنی حکم ہے جس کا بالکل واضح انداز میں یہ اعلان کیا گیا ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ (آیات: ۲۴-۲۳)

(اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اف تک نہ کہنا، نہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا بلکہ ان کے ساتھ ادب واحترام سے بات چیت کرنا اور عاجزی اور محبت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست رکھے رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔)

مگر ان فضلاء کا اصرار ہے کہ یہ صریح، عام فہم حکم بائبل کی اس گنجلک عبارت سے ماخوذ ہے (۲۰):

"کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے بچوں کو جمع کر دوں مگر تم نے نہ چاہا"۔ (لوقا ۱۳: ۳۴)

"کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تمہارے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ (متّی ۲۳: ۳۷)

ان فضلاء کے دعوی کے برعکس بائبل کے ان اقتباسات میں والدین کے ساتھ حسن معاشرت کا کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ موضوع خدا ر عیسیٰؑ کا بنی اسرائیل سے شفقت کا اعلان ہے جس کے نامکمل ہونے پر تاسف ہے۔ مزید برآں بائبل کی ان دونوں کتابوں میں "بچوں" اور "لڑکوں" کے درمیان تفریق قابل غور ہے۔ اگر صرف لڑکے ہی مراد ہیں تو لڑکیوں سے اس امتیاز کا کیا جواز ہے۔ مزید برآں خدا ر عیسیٰؑ کا ان کو مجتمع نہ کرنے پر بے بسی کا اظہار ناقص تصور خدا ہے جو قوت اور عمل سے عاری ہے۔ یہ اقتباسات جن کا ان فضلاء نے بڑے فاتحانہ انداز میں ذکر کیا ہے، بائبل سے متعلق متعدد سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔

آیت: ۲۴ر میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے لئے رحمت الٰہی کی دعا کریں۔ یہ آیت بھی ان فضلاء کی رائے میں بائبل کے مذکورہ بالا اقتباسات پر مبنی ہے جب کہ درحقیقت ان اقتباسات اور قرآن مجید کی عبارت میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔اول الذکر میں والدین کی جانب اشارہ ہے، جب کہ موخر الذکر ایک جامع ،موثر دعا ہے جو اللہ نے اہل ایمان کو سکھائی ہے کہ وہ اپنے والدین کے لئے جذبہ تشکر اور احسان مندی کے ساتھ کرتے رہیں۔

(۹) آیت: ۳۲ حرمت زنا سے متعلق ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلًا.

خبردار! زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا کیوں کہ وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی بری راہ ہے۔

ان فضلاء نے اس کی نسبت یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ حکم غیر واضح ہے اور اس کی کوئی تشریح نہیں ملتی (۲۱)۔قرآنی حکم بے غبار حد تک واضح ہے۔فعل زنا تو درکنار، اس کے متعلقات تک کی صریح ممانعت اور اس کی شناعت کے لئے دو دو مذمتی الفاظ ''بے حیائی'' اور ''بہت ہی بری راہ'' مستعمل ہوئے ہیں۔غالباً ان فضلاء کو بائبل کے زنا سے متعلق مندرجہ ذیل احکام کے پیش نظر یہ خلجان ہوگا:

''اگر کوئی اپنی چچی یا تائی سے صحبت کرے تو اس نے اپنے چچا یا تاؤ کے بدن کو بے پردہ کیا۔سو ان کا گناہ ان کے سر لگے گا۔ وہ لاولد مریں گے۔اگر کوئی شخص اپنے بھائی کی بیوی کو رکھے تو یہ نجاست ہے، وہ لاولد رہیں گے''۔(احبار ۲۰:۲۱ص ۱۱۴)

یہاں زنا جیسے قبیح فعل کے لئے ''صحبت کرنا'' اور ''رکھنا'' عجیب ہے۔مزید برآں ان کی کوئی سزا متعین کرنے کے بجائے صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ گار ''لا ولد'' مریں گے۔ اولاً یہ کلیہ عملاً غلط ہے، زنا کے نتیجے میں حمل ٹھہرنا ایک معروف امر ہے، اس ضمن میں کوئی الٰہی مداخلت نہیں ہوتی اور پھر محض ''لا ولد'' رہ جانا عملاً کوئی سزا ہے ہی نہیں۔بھائی کی بیوہ سے عدت کے بعد نکاح کو زنا کی صف میں رکھنا ایک اور ناقابل توجیہ پہلو بائبل کے مذکورہ بالا حکم کا ہے۔

بائبل کاہن کو اس حکم کا پابند بناتی ہے: ''اس عورت سے بیاہ نہ کریں جسے اس کے شوہر نے طلاق دی ہو کیونکہ کاہن اپنے خدا کے لئے مقدس ہے''۔(احبار ۲۱:۷، ص ۱۱۴) مطلقہ عورت کی یہ ناپاکی ناقابل دفاع ہے۔اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض بائبل کا یہ حکم ہے:

''خداوند نے موسیٰ سے کہا: ہارون سے کہہ دے کہ تیری نسل میں پشت در پشت اگر کوئی کسی طرح کا عیب رکھتا ہے تو وہ اپنے خدا کی غذا گزراننے کو نزدیک نہ آئے۔خواہ کوئی ہو جس میں عیب ہو وہ نزدیک نہ آئے، خواہ وہ اندھا ہو یا لنگڑا ہو، یا نک پھٹا ہو یا زائد الاعضاء، یا اس کا پاؤں ٹوٹا ہوا ہو یا ہاتھ ٹوٹا ہو یا وہ کبڑا یا بونا ہو یا اس کی آنکھوں میں کچھ نقص ہو یا کھجلی بھرا ہو یا اس کے پپڑیاں ہوں یا اس کے خصیے پچکے ہوئے ہوں...... وہ مذبح کے پاس نہ آئے، اس لئے کہ وہ عیب دار ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ میرے مقدس مقاموں کو بے حرمت کرے کیوں کہ میں خدا ان کا مقدس کرنے والا ہوں''۔(احبار ۲۱:۱۸-۲۱ اور

۲۲-۲۳،ص ۱۱۵)

اس کے عین برعکس قرآن مجید میں معذور افراد کی تالیف قلب مذکور ہے۔سورہ عبس میں نابینا صحابی ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کا بہترین مرقع ہے۔قرآن مجید میں رسول اکرم ﷺ پر نکیر ہے کہ آپ ﷺ نے سہواً ایک معذور صحابی سے کیوں بے رخی برتی۔(عبس ۸۰:۱-۱۲)۔رسول اکرمؐ نے متعدد معذور صحابہ کرام کو اعلیٰ مناصب پر مقرر کیا (مثلاً عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور عطا ابن ابی رباح رضی اللہ عنہ)۔احادیث میں جسمانی طور پر معذور افراد سے حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے(۲۲)۔

زنا کے بارے میں قرآنی ممانعت سے متعلق ان فضلاء کے اشکال کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ بائبل (احبار ۲۰:۱۰) میں صرف شادی شدہ زانیوں کی سزا مذکور ہے جب کہ اسلام میں زنا مطلق طور پر حرام ہے اس کا مرتکب خواہ غیر شادی شدہ شخص ہو یا شادی شدہ شخص، سب ہی لائق تعزیر ہیں۔زنا کی یہ مطلق شناعت غالباً ان مغربی فضلاء پر روشن نہیں۔

(۱۰) آیت: ۳۴ میں اللہ نے یتیموں کا مال ناحق کھانے کے خلاف خبردار کیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ.

اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ بجز اس طریقہ کے جو بہت ہی بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی بلوغت کو پہنچ جائے۔

ان فضلاء کی عقل پر ماتم کرنے کا مقام ہے کہ انھوں نے اس قرآنی حکم کو Syrian Homilies سے مستعار قرار دیا ہے(۲۳)۔پند و موعظت پر مشتمل یہ مجموعہ اقوال منسوب ہے۔یہ ۶۸۸ء یعنی قرآن مجید کی تکمیل/تحریر ہوا، اس کے متفرق اجزاء قلمی پارچوں کی ہوتے رہے۔مجموعہ کی شکل میں یہ اولین دفعہ سریانی زبان کی یہ تحریر جو مکمل اور قلمی نسخے تک کے ۶۳۳ء کے قرآن مجید کا ماخذ قرار دنیا علمی خیانت

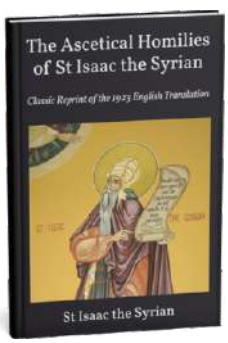


نینوا، شام کے اسقف اعظم اسحاق (Issac) سے وفات نبوی کے ۵۵/سال بعد سریانی زبان میں صورت میں چودھویں صدی عیسوی تک دریافت یونانی ترجمے کے طور پر ۱۳۷۴ء میں سامنے آیا۔ طور پر چودھویں صدی میں منظر عام پر آئی، اسے بھی ہے اور ذہنی دیوالیہ پن بھی۔

(۱۱) آیات: ۳۶-۳۷ انسان کی مسئولیت اور تکبر کی مذمت سے متعلق ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا.

جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ۔کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتا ہے۔

خلط مبحث میں مبتلا ان فضلاء نے اس قرآنی تنبیہ کو بائبل کی زبور (۱۰۹:۲ اور ۱۲۰:۲) کے مماثل

قرار دیا ہے جو کہ امر واقعہ ہے ہی نہیں (۲۴)۔ زبور کے ان اقتباسات میں پیغمبر کی شریر اور دغا باز افراد کے خلاف خدا سے فریاد ہے (زبور ۱۰۹:۲) اور اسی کا اعادہ زبور ۱۲۰:۲ ہے۔ ان دونوں مضامین میں کوئی مماثلت نہیں۔ قرآن مجید کا مقصود انسان میں اس شعور کو بیدار اور پختہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اعضاء اور جوارح اور اعمال کے لئے اللہ کے سامنے جوابدہ ہے اور اس کا تکبر اللہ کی کبریائی کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا ہے۔

(۱۲) آیات ۲۲ تا ۳۹ میں متعدد احکام مذکور ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے بھی ہے اور حقوق العباد سے بھی۔ ان فضلاء کی یہ نکتہ آفرینی قابل استہزاء ہے کہ ان کے بقول ہر چند کہ قرآن مجید نے احکام کی ایک طول طویل فہرست بیان کر دی ہے لیکن اس کے مطابق لائق تعزیر جرم صرف شرک ہے جس کی سزا آیت ۳۹ میں درج ہے بقیہ احکام کی خلاف ورزی پر کسی سزا کا اعلان نہیں ہے (۲۵)۔ یہ امر معروف ہے کہ قرآن مجید خود اپنی تفسیر پیش کرتا ہے۔ ایک آیت میں جو بیان ہے اسی کی توضیح اور تشریح دیگر قرآنی آیات میں ہے۔ احکام القرآن کے موضوع پر تفاسیر (از جصاص، قرطبی، ابن العربی، طحاوی) میں ان کی تفصیل دستیاب ہے۔

ان فضلاء نے اپنی دانست میں یہ بڑا معرکہ سر کیا ہے کہ یہ نشاندہی کی ہے کہ شرک کی سنگین سزا تالمود میں بھی ہے اور وہی اس قرآنی حکم کی اساس ہے۔ توریت اصلاً کتاب الٰہی ہے گو اس کی موجودہ شکل تحریف شدہ ہے، لیکن اس کے باوصف توحید کا پیغام اور شرک کی شناعت اب بھی اس کا جزو ہے۔ یہ کیفیت عیسائی انجیل (نئے عہد نامہ) کی نہیں ہے جا بجا خدا اور عیسیٰؑ یکساں درجہ الوہیت پر متمکن، عیسیٰؑ کا ابن اللہ اور بنی نوع انسان کے شفیع ہونے کے باطل عقائد اس پر مستزاد۔

(۱۳) آیات ۴۹ تا ۵۱ میں اللہ کی قدرت حیات بعد الممات کا اثبات ہے:

وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا۔ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا۔ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا.

انھوں نے کہا، کیا جب ہم ہڈیاں اور (مٹی ہو کر) ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے پھر دوبارہ اٹھا کر کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ جواب دیجئے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی خلقت جو تمہارے دلوں میں بہت ہی سخت معلوم ہو، پھر وہ پوچھیں کہ کون ہے جو دوبارہ ہماری زندگی لوٹائے؟ آپ جواب دے دیں کہ وہی اللہ جس نے تمہیں اول بار پیدا کیا، اس پر وہ اپنے سر ہلا ہلا کر آپ سے دریافت کریں گے کہ اچھا یہ ہے کب؟ تو آپ جواب دے دیں کہ کیا عجب کہ وہ (ساعت) قریب ہی آن لگی ہو۔

اس واضح، استدلالی قرآنی بیانیے کا موازنہ بائیل کے حسب ذیل اقتباسات سے کرنا چاہئے کہ ان فضلاء کی رائے میں یہی قرآن مجید کے بیان کی بنیاد ہیں (۲۶):

''خداوند کا ہاتھ مجھ (حزقی ایل) پر تھا، اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھایا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُرتھی اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس جو گرد پھرایا......اس نے مجھ سے فرمایا تو ان ہڈیوں پر نبوت کر......جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں......میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں......(حزقی ایل ۳۷:۱-۳، ۷ اور ۱۰-۱۱، ص ۸۱۶)

یہاں بیانیہ تمام تر نبی حزقی ایل کے معجزے پر مرکوز ہے کہ کسی طرح خدا کے حکم کے مطابق ان کے ہاتھوں سوکھی ہڈیاں زندہ افراد (بنی اسرائیل) میں تبدیل ہو گئیں، قرآن مجید کے برخلاف روز قیامت اور آخرت یہاں مذکور نہیں۔

قرآن مجید میں سرقے کا دوسرا حوالہ ان فضلاء نے انجیل کے اس بیان کا دیا ہے:

''میں یوحنا نبی تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابرہام کے لئے اولاد پیدا کر سکتا ہے''۔(متّی ۳:۹، ص ۶)

یہاں بھی موضوع آخرت میں حیات بعد الموت نہیں ہے بلکہ اظہار خدا کی قدرت کاملہ کا ہے لہذا اس دعوی میں کوئی وزن نہیں کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات بائبل سے ماخوذ ہیں۔

(۱۴) آیت ۵۵ میں ذکر داؤد اور ان پر نازل کتاب الٰہی زبور کا ہے۔ قرآن میں مذکور اس امر واقعہ پر کوئی اعتراض جڑنے سے قاصر رہنے پر ان فضلاء نے قضیہ یہ چھیڑا کہ ایک اور مقام پر قرآن مجید نے داؤد کا استخفاف کیا ہے اور حوالہ اس آیت قرآنی کا دیا ہے (۲۷):

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ (سورۂ ص - آیت 26)

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی، یقیناً جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے۔

اس آیت سے داؤدؑ کے اعلیٰ اور ارفع مقام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ فضلاء چونکہ ایک نبی عیسیٰؑ کے اللہ کے شریک اور فرزند ہونے کے تصور سے مغلوب ہیں، داؤد کو احکم الحاکمین کا یہ خطاب ان کی طبع خاطر پر غالباً گراں گزرا ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ لازم ہے کہ نبی بہرکیف بشر اور اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بشریت انبیاء بشمول ان کی لغزشوں کا ذکر ملتا ہے۔ اللہ کے حبیب محمدؐ رسول اللہ کے بعض اعمال پر بھی قرآن مجید میں گرفت ملتی ہے۔ عصمت انبیاء کا اسلامی عقیدہ ان برگزیدہ شخصیات کی وقتی، بشری کمزوریوں اور محدود دائرہ علم کے منافی نہیں ہے۔

(۱۵) آیات ۵۶ اور ۵۷ میں باطل معبودوں کی بے بسی اور مجبوری کو نمایاں کیا گیا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ

رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا.

کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوا جنہیں تم معبود سمجھ رہے ہو انہیں پکار و لیکن نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں۔ جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں خود وہ اپنے رب کے تقرب کی جستجو میں رہتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ نزدیک ہو جائے وہ خود اس کی رحمت کی امید رکھتے اور اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں، (بات بھی یہی ہے) کہ تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے۔

ان فضلاء کے مطابق ان سے مراد فرشتے نما ارواح / جنات ہیں اور قرآن مجید میں ان کا ماخذ ایک قدیم یہودی صحیفہ Ethiopian Book of Enoch ہے (۲۸) جو دوسری / تیسری صدی قبل مسیح کا ہے جو کہ حبشی زبان میں ہے۔ اس کی ایک کلیدی جہت یہ ہے کہ یہ اس خرافات پر مبنی ہے کہ

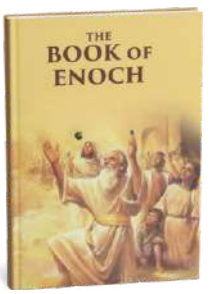


بعض فرشتے انسانی گوشت پوست کی حسین و جمیل عورتوں پر فریفتہ ہو بیٹھے، ان سے جسمانی تعلقات کے مرتکب ہوئے اور اس کی پاداش میں جنت سے جلاوطن ہوئے اور ان ہی کی بدولت دنیا میں گناہ اور غیر اخلاقی افعال کا رواج ہوا۔ یہ صحیفہ یہودیوں کے صرف ایک غیر معروف اقلیتی گروہ یعنی حبشی یہودیوں کے لئے قابل قبول ہے عام یہود اسے زندقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان فضلاء کی قوت تخیل قابل داد ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک امی (محمدؐ رسول اللہ) بائبل پر عبور کے پہلو بہ پہلو یہودیت اور عیسائیت کے مختلف زبانوں میں غیر معروف بلکہ متروک صحائف میں بھی ایسا درک رکھتا تھا کہ اس نے ان تمام مآخذ کا انتہائی چابک دستی سے استعمال کیا۔

(۱۶) آیت ۵۹ میں اہل ثمود کی معجزاتی اونٹنی اور آیت ۶۰ میں معراج کے دوران محمدؐ رسول اللہ کی الشجرۃ الملعونۃ (الزقوم) کی رویت کے حوالے ہیں۔ بائبل ان تلمیحات سے عاری ہے لہذا ان فضلاء کی دانست میں یہ محض خیالی ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں (۲۹)۔ اس پوری تفسیر میں ان فضلاء کا یہی منہج ہے کہ اگر متن قرآنی میں کوئی تصور / اصطلاح / عقیدہ کسی نہ کسی لحاظ سے بائبل سے مماثل ہے تو اسے بلا تکلف بائبل سے سرقہ قرار دیتے ہیں اور اگر کوئی لوازمہ بائبل سے مشابہ نہیں ہے تو اس کے وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں ان کا رد اور قبول کا پیمانہ صرف اور صرف بائبل اور اس کے متعلقات ہیں، کچھ کیفیت اس شعر کے مصداق:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

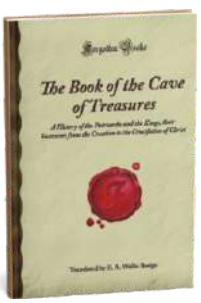


(۱۷) آیات ۶۱ تا ۶۵ ابلیس کے تکبر، آدمؑ کے آگے سجدہ کرنے سے انکار، بنی نوع انسان کے دشمن ہونے اور ان کو گمراہ کرنے پر مشتمل ہیں، گو اس صراحت کے ساتھ کہ ابلیس صرف شر کی ترغیب دے سکتا ہے، اس کو انسان پر کوئی قدرت یا اختیار مطلق نہیں اور متقی اہل ایمان شیطان کے وسوسے سے محفوظ اور مامون رہتے ہیں۔ ان فضلاء کی رائے میں یہ پورا بیانیہ سریانی زبان میں ساتویں صدی عیسوی

کے ایک عیسائی صحیفے The Cave of Treasures سے مستعار ہے(۳۰)۔ یہ تحریر مخطوطے کے طور پر گوشۂ گمنامی میں رہی اور ۱۸۸۳ء میں پہلی مرتبہ اس کا جرمن ترجمہ شائع ہوا۔مستشرقین کے ان قیاسات کی بنیاد پر تصویر کچھ یہ بنتی ہے کہ ساتویں صدی کے اُمی نبی محمدؐ رسول اللہ کا ایک انتہائی وسیع کتب خانہ تھا جس میں سریانی، آرامائی، حبشی، عبرانی اور دیگر قدیم زبانوں کے تمام قلمی مخطوطات دستیاب تھے اور وہ کسی ہفت زباں فاضل محقق کی مانند ان کے مطالعے میں مستغرق رہتے اور گوہر آبدار تلاش کر کے ان کی بنیاد پر نعوذ باللہ قرآن مجید کی تصنیف میں مصروف رہتے۔آپؐ کی سیرت طیبہ کے روز وشب کے تمام کوائف بالاستیعاب چشم دید مشاہدین صحابہ کرام نے فراہم کیے ہیں۔اوائل ساتویں صدی کے مکہ رحجاز میں علم اور تحقیق تو کجا، خواندگی کی سطح برائے نام تھی اور آپؐ کا مطلق ناخواندہ ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے۔اس صورت میں آپؐ کی نسبت غیر زبانوں کے ایسے ناقابل رسائی م آخذ کی نشاندہی محض ایک فعل عبث ہے۔

(۱۸) آیات:۶۶اور ۶۷ نعمت الٰہی سے بھی متعلق ہیں اور انسان کے کفریہ رویہ سے بھی:

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنسَانُ كَفُورًا.

تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔وہ تمہارے اوپر بہت ہی مہربان ہے۔اور سمندروں میں مصیبت پہنچتے ہی جنہیں تم پکارتے تھے سب گم ہو جاتے ہیں صرف وہی اللہ باقی رہ جاتا ہے۔پھر جب وہ تمہیں خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو تم منھ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

زبور میں یہ سرسری اشارہ ہے:

”دیکھو یہ بڑا اور چوڑا سمندر جہاز اس میں چلتے ہیں“۔

(زبور ۱۰۴:۲۵-۲۶) (۳۱)

محض اس برائے نام مماثلت کے پیش نظر ان فضلاء کا اصرار ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات زبور کا عکس ہیں(۳۲)۔زبور کی عبارت میں نہ ذکر فضل الٰہی کا ہے، نہ اللہ کی قدرت اور ربوبیت کا، نہ حفاظت اور سرپرستی کا اور نہ انسان کی عام احسان فراموشی کی روش کا۔لیکن ان سب کے باوصف اعتراض یہی ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ندرت، کوئی جودت نہیں، یہ محض بائبل کی ناکام نقل ہے۔العیاذ باللہ!

(۱۹) آیت:۷۰ فضیلت بنی آدم کے بارے میں ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا.

یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور

اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی۔

ان فضلاء کی تحقیق کے بموجب یہ بائبل کے ان جملوں سے مستعار ہے(۳۳):

”تو نے اسے(آدم زاد)کو خدا سے کچھ ہی کمتر بنایا ہے اور جلال اور شوکت سے اسے تاجدار کرتا ہے“۔(زبور ۸:۵)(۳۴)

بائبل کا بیان خاصا مبالغہ آمیز ہے۔انسان کا خدا سے تقریباً ہم سر ہونا اور شوکت اور جلال کا حامل ہونا تعلّی سے مملو ہیں۔قرآن مجید میں جا بجا انسان کی عبدیت،اللہ رب العالمین پر اس کے کلی انحصار اور اسی باعث تذلل اور توکل پر قائم رہنے کی تاکید کا سبق ہے جو کہ بائبل کی مذکورہ بالا عبارت میں مفقود ہے۔

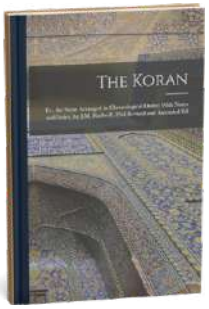

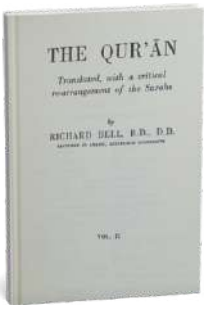







(۲۰)یہ فضلاء قرآن مجید کی توقیفی ترتیب پر بھی معترض ہیں(۳۵)۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہدایت کے مطابق محمدؐ رسول اللہ نے کاتبین وحی اور صحابہ کرام کو ہدایت کی کہ وحی الٰہی کو کس ترتیب کے مطابق مدون کیا جائے اور قرآنی سورتوں کا کیا شمار نمبر ہو۔قرآن مجید کی ترتیب نزولی نہیں ہے۔یہ حکمت الٰہی مستشرقین کے لئے ناقابل فہم ہے۔جے۔ایم۔راڈویل(J.M Rodwell)۱۸۰۸ء-۱۹۰۰ء اور رچرڈ بیل(Richard Bell)۱۸۷۶ء-۱۹۵۲ء تو ایسے دیدہ دلیر انگریزی مترجمین قرآن مجید ہوئے کہ انھوں نے اپنے انگریزی تراجم علی الترتیب ۱۸۶۱ء اور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء میں قرآن مجید کے متن کی ترتیب ہی مسخ کر دی اور توقیفی کے بجائے نزولی ترتیب کو اختیار کیا ہے(۳۶)۔ایک مذہبی گروہ کی مقدس کتاب میں ایسی جسارت آمیز مداخلت ان کے تکبر اور احساس تفوق کی غماز ہے۔

زیر مطالعہ تفسیر کے مصنف ان دونوں فضلاء کا یہ فیصلہ ہے کہ سورہ الاسراء آیت ۸۱ پر ختم ہے۔آیات ۸۲ تا ۱۱۱ بعد میں داخل کر دی گئیں جو کہ ایک سقم ہے۔ان خود ساختہ جامعین قرآن مجید نے اس اعتراض کی تکرار ایک اور مقام پر اپنی تفسیر میں کی ہے۔

(۲۱)آیت ۸۲ میں قرآن مجید کو اہل ایمان کے حق میں شفاء اور رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا.

یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لئے تو سراسر شفا اور رحمت ہے۔ہاں ظالموں کو بجز نقصان کے اور کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔

یہاں بھی ان فضلاء نے بائبل کے ایک غیر متعلق اقتباس کا حوالہ دیتے ہوئے فاتحانہ انداز میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآنی بیان بائبل کا چربہ ہے(۳۷)جب کہ درحقیقت بائبل کے اس محولہ اقتباس میں روداد ہے ایک معجزے کی کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل تین دن کے سفر کے بعد مارہ پہنچے۔چوں کہ دوران سفر انہیں پانی نصیب نہیں ہوا تھا۔مارہ میں قدرتاً وہ پانی کی جانب لپکے لیکن وہ:

”مارہ کا پانی پی نہ سکے کیونکہ وہ کڑوا تھا۔اسی لئے اس جگہ کا نام مارہ پڑ گیا۔موسیٰ نے خداوند سے فریاد کی۔خداوند نے اسے ایک

پیڑ دکھایا جسے جب اس نے پانی میں ڈالا تو پانی میٹھا ہو گیا‘‘۔(خروج ۱۵: ۲۲-۲۵،ص ۶۸)

بائبل اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا دونوں بیانات کے مقصود مختلف ہیں، ان کو ایک دوسرے کا مماثل قرار دینا یا اسے قرآنی آیت کی بنیاد پر محمول کرنا ان فضلاء کی کم علمی پر دلالت کرتا ہے۔

(۲۲) آیت ۹۹ اللہ کی قوت قاہرہ اور کاملہ کا اعلان ہے۔ سورہ البقرہ ۲: ۲۵۵ معروف بہ آیت الکرسی میں یہ صراحت ہے کہ اللہ کو غنودگی یا نیند لاحق نہیں ہوتی۔ بائبل میں اس کے برخلاف تخلیق کے ساتویں دن یوم السبت Sabbath کو خدا نے آرام کیا (پیدائش ۲: ۲-۳)۔ اس تضاد پر پردہ ڈالنے کے لئے ان فضلاء نے زبور کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے:

’’دیکھ اسرائیل کا محافظ نہ اونگھے گا نہ سوئے گا‘‘۔(زبور ۱۲۱: ۴)(۳۸)

یہاں آفاقی خدا کو جو کہ رب العالمین ہے، صرف اسرائیل کے محافظ کے طور پر محدود کر دینا نہایت معیوب بلکہ خدا کی شان میں گستاخی ہے جس پر ان فضلاء نے کوئی لب کشائی نہیں کی ہے۔ قرآن مجید میں خدا صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ ہر ہر عالم کے ہر ہر مخلوق کا رب اور مالک ہے، اسے عرب سے کوئی خصوصی نسبت نہیں ہے۔

(۲۳) آیت ۱۰۱ میں فرمان الٰہی ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کو نو معجزے عطا کئے۔ ان فضلاء نے اپنی دانست میں قرآن مجید کی یہ اصلاح کی ہے کہ بائبل میں دس معجزات مذکور ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کا سنگین اور شنیع اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ سارے معجزے اللہ سے منسوب ہیں جب کہ بائبل کے مطابق تین معجزات ہارونؑ، تین موسیٰؑ اور صرف تین خدا نے بپا کئے تھے۔ دسواں معجزہ ہارونؑ، موسیٰؑ اور خدا کی مشترک کاوش تھا۔(کتاب خروج، باب ۷، ۸، ۱۰ اور ۱۱)(۳۹)۔ بائبل کے ایک فاضل اسپیر Speyer نے بھی اسی نکتے کا بڑے شدومد سے اعادہ کیا ہے۔(۴۰)

(۲۴) آیت ۱۰۴ میں قول الٰہی ہے: ’’ہم نے بنی اسرائیل سے فرمادیا کہ اس سرزمین پر تم رہو‘‘۔ یہ فضلاء اس پر معترض ہیں کہ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی تاریخ بیان کرنے میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان پر یہ بدیہی حقیقت روشن نہیں کہ قرآن کا موضوع اور مخاطب کل کی کل اور ہمیشہ ہمیش کی نوع انسان ہے۔ اس میں تاریخ اور جغرافیہ کی تفصیلات بڑی حد تک غیر متعین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ابدی پیغام ساتویں صدی عیسوی یا اس سے ماقبل تک محدود نہیں ہے۔ قریش، حجاز اور عرب تک کے حوالے چند ہی ہیں جب کہ بائبل کا محور اول تا آخر بنی اسرائیل اور ان کی تاریخ ہے۔ ان کے تصور خدا تک کی شناخت نسلی ہے یعنی ہر مقام پر اسے صرف بنی اسرائیل کے خدا کے طور پر متعارف کیا گیا ہے۔ کسی غیر اسرائیلی کے لیے بائبل کا مطالعہ انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن ہے کہ پورا بیانیہ صرف ایک نسل کے اردگرد محصور ہے اور کسی غیر اسرائیلی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآن مجید کا دائرہ آفاقی ہے اور اس کے محتویات آج بھی اتنے ہی حسب حال ہیں جیسے نزول قرآن مجید کے دور یعنی ساتویں صدی عیسوی میں تھے۔

(۲۵) آیت ۱ میں ’’مسجد اقصیٰ کے آس پاس اللہ کی برکت‘‘، مذکور ہے۔ یہ تقدس اسے متعدد انبیائے کرام کے مسکن اور مدفن

ہونے کی نسبت سے حاصل ہے۔ان مستشرقین میں بائبل کے زیر اثر اللہ کی تجسیم کا تصور ایسا راسخ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی عبارت ان کو بائبل کے اس جملے کے مثل نظر آتی ہے(۴۱):

''اور روح نے مجھے (حزقی ایل نبی) کو اٹھالیا اور میں نے اپنے پیچھے ایک بڑی کڑک کی آواز سنی جو کہتی تھی کہ خداوند کا جلال اس کے مسکن سے مبارک ہو''۔(حزقی ایل ۳:۱۲)(۴۲)

قرآن مجید میں خدا کی کڑک اور مسکن کا مطلق کوئی حوالہ نہیں لہٰذا ان دونوں عبارتوں کو مماثل قرار دینا محض خام خیالی ہے۔

(۲۶) آیات ۴ تا ۸ میں بنی اسرائیل کے دو بار فساد برپا کرنے اور اس کی پاداش میں بیت المقدس کی بے حرمتی اور بنی اسرائیل کی ذلت بطور عبرت درج ہے۔اس ناقابل تردید حقیقت پر کسی تبصرے کے بجائے ان فضلاء نے حیلہ سازی یہ کی ہے کہ اپنے اس استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ قرآن مجید کو مکہ/کعبہ سے کوئی سروکار نہیں اور تذکرہ صرف ان اشخاص اور مقامات کا ہے جو بائبل کے حوالے سے معروف ہیں(۴۳)۔گویا قادر مطلق اللہ رب العالمین کو قرآن مجید کے اپنے ابدی پیغام میں صرف مقامی حالات اور ظروف (مکہ/کعبہ/قریش) پر قناعت کرنا چاہیے تھا۔تکذیب حق میں انسان کا ذہن کہاں کہاں بھٹک جاتا ہے۔

(۲۷) آیت ۴۲ میں اللہ کے لیے لقب ''ذی العرش'' آیا ہے۔ان فضلاء کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں کہیں صاحب عرش کے خدوخال واضح نہیں ہوتے۔محمدؐ رسول اللہ کی رویت الٰہی ثابت نہیں ہوتی جب کہ بائبل کے مطابق یسعیاہ نبی کو یہ شرف حاصل ہوا(۴۴):

''جس سال میں عزیاہ بادشاہ نے وفات پائی،میں نے خداوند کو ایک بڑی بلندی پر اونچے تخت پر بیٹھے دیکھا اور اس کے لباس کے دامن سے ہیکل معمور ہوگئی''۔(یسعیاہ ۶:۱،ص ۶۶۵)

قرآن مجید میں رویائے الٰہی کا فقدان ان کی دانست میں ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔اسلام تجسیم خداوندی کا مطلق قائل نہیں لیکن یہ فضلاء اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ان کے مطابق یسعیاہ نبی کی رویت میں زمان کی بھی صراحت ہے اور یہ مفصل بھی ہے۔اس کے برعکس سورہ النجم میں کوئی زمانی تحدید نہیں اور رسول کو وحی بواسطہ موصول ہوئی،جب کہ رسول رویائے الٰہی سے محروم رہا۔

(۲۸) سورہ النجم آیات ۵ تا ۱۰ میں فرشتۂ وحی جبریلؑ کا مفصل بیان ہے اور ان کے اوصاف کا حال ہے لیکن ان فضلاء کی نظر میں بائبل کا یہ بیان زیادہ لطیف ہے:''خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی''۔(پیدائش ۱:۱)۔قرآن مجید میں روح القدس کی اس شبیہ کی غیر موجودگی ان کی دانست میں ایک سقم ہے(۴۵)۔سورہ النجم میں جبریلؑ کی مفصل حرکات اور سکنات سے ان فضلاء کی پہلو

تھی بظاہر نا قابل توجیہ ہے اور ان کا اعتراض صرف برائے اعتراض کے ذیل میں آتا ہے۔

(۲۹)ان فضلاء نے سورہ الاسراء میں معراج کے بیانیے کے بالمقابل بائبل کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے، جس میں حزقی ایل نبی نے اپنے رویائے الٰہی کی تفصیلات بقید زمان ومکان بیان کی ہیں (۴۶):

''اور چھٹے برس کے چھٹے مہینے کی پانچویں تاریخ کو یوں ہوا کہ میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور یہوداہ کے بزرگ میرے سامنے بیٹھے تھے کہ وہاں خداوند خدا کا ہاتھ مجھ پر ٹھہرا تب میں نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شبیہ آگ کی مانند نظر آتی ہے...... اس نے ایک ہاتھ کی سی شبیہ سی بڑھا کر میرے سر کے بالوں سے مجھے پکڑا اور روح نے مجھے آسمان اور زمین کے درمیان بلند کیا اور مجھے الٰہی رویا میں یروشلم میں شمالی پھاٹک پر جہاں غیرت کی مورتی کا مسکن تھا جو غیرت بھڑکاتی ہے آئی اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اسرائیل کے خدا کا جلال اس رویا کے مطابق جو میں نے اس وادی میں دیکھی تھی موجود تھی۔ تب مجھ سے اس نے فرمایا......''۔(حزقی ایل ۸:۱-۲ اور ۳-۵)(۴۷)

قدیم یروشلم

بائبل کے اس اقتباس میں تجسیم خداوندی، خدا کے اسرائیل کے خدا ہونے کی تصریح، اور یروشلم کی تقدیس اور مرکزیت اور مورتی کی موجودگی قابل غور ہیں۔ ایسی خرافات کے پروردہ یہ فضلاء سورۃ الاسراء کے حشو وزوائد سے پاک بیان سے قدرۃ ناخوش اور غیر مطمئن ہیں۔

(۳۰) سورۃ الاسراء ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل آخر مکی دور میں نازل ہوئی، اندازاً ۶۲۲ء میں۔ سیرۃ طیبہ کو مطعون کرنے کے مقصد سے مغلوب ان فضلاء نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ چونکہ ۶۱۴ء میں ساسانیوں کی یروشلم پر یلغار کے نتیجے میں عیسائی یروشلم پر اقتدار سے معزول کر دیے گئے تھے اور فاتحین نے شہر کا انتظام وقتی طور پر یہودیوں کی ایک مجلس شوری کے سپرد کر دیا تھا محمدؐ رسول اللہ نے اس غیر یقینی سیاسی صورتحال اور عدم استحکام کا فائدہ اٹھانے کی غرض سے اس سورہ کے ذریعے مسجد اقصی / یروشلم پر اپنا دعوی پیش کر دیا (۴۸)۔ اگر اس الزام میں کوئی صداقت ہوتی تو محمدؐ رسول اللہ مدنی دور میں یروشلم پر فتح اور قبضے کی کوئی کوشش کرتے کہ اس دور میں آپؐ کی قیادت میں مسلم فوج اور وسائل اس غزوہ کے عین متحمل تھے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عالم عرب اور اس سے متصل علاقوں پر بتدریج اسلام کا غلبہ ہوتا گیا اور اسی سلسلۂ فتوحات میں خلیفہ ثانی عمرؓ کے دور میں ۶۳۸ء میں برضا ورغبت یروشلم

کے عیسائیوں نے بغیر قتل وخون کے سپر اندازی کی۔ یہ واقعہ وفات نبوی کے ۱۵/سال بعد پیش آیا مگر ان فضلاء کا سوئے ظن یہ ہے کہ آپ نے یروشلم پر قبضے کا منصوبہ ۶۱۴ء ہی میں بنالیا تھا۔ مستشرقین بالعموم رسول اکرم کو ایک طالع آزما شخصیت کے طور پر مسخ کر کے پیش کرتے ہیں جس نے مذہبی، سیاسی، قبائلی، معاشرتی اور عسکری عوامل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقتدار کلی حاصل کرلیا۔

(۳۱) قرآن مجید نے یہودیوں کی نسبت سے ''الارض المقدسة'' (المائدہ ۵: ۲۱) وادی سینا کو ''مقدس'' (طہٰ ۲۰: ۱۲) اور کوہ طور کی سرزمین کو ''البقعة المباركة'' (القصص ۲۸: ۳۰) سے ملقب کیا ہے۔ یہ اعزاز و اکرام موحد بنی اسرائیل اور کلیم اللہ موسیٰ کی بدولت ہے، اسی کے پہلو بہ پہلو قرآن مجید نے طاغی اور باغی بنی اسرائیل کے معاصی اور خباثتوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے کہ اللہ منصف مطلق ہے لیکن بنی اسرائیل سے متعلق ''مقدس'' اور ''بابرکت'' الفاظ کو ان فضلاء نے یہ فتنہ پرور معنی پہنائے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ یہودیت سے نفسیاتی طور پر مرعوب رہے (۴۹)۔ قرآن مجید کی اس انصاف پسندی کو انھوں نے رسول اکرمؐ کی بشری کمزوری سے منسوب کردیا ہے۔

(۳۲) آیت ۴ میں اللہ کا اعلان ہے:

> وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا.
>
> ہم نے بنی اسرائیل کے لئے ان کی کتاب میں صاف فیصلہ کردیا تھا کہ تم زمین میں دوبار فساد برپا کروگے اور تم بڑی زبردست زیادتیاں کروگے۔

آیات ۵ اور ۷ میں یہود بشمول ہیکل کی ذلت آمیز تباہی کی داستان ہے، اس کے باوصف بھی ان فضلاء نے کج بحثی یہ کی ہے کہ قرآن مجید نے یہودیوں کو قصوروار نہیں قرار دیا ہے (۵۰)۔ یہ صریحاً غلط بیانی ہے کیونکہ آیت ۴ میں صراحت ہے: ''تم (اے بنی اسرائیل) بڑی زبردست زیادتیاں کروگے''۔

(۳۳) ان فضلاء نے تفاخر کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی اساس بائبل میں پہلے سے درج احکام عشرہ اور قصص الانبیاء پر ہے جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا (۵۱)۔ احکام قرآنی اور احکام عشرہ میں نمایاں فرق ہے۔ قرآن مجید میں احکام قرآنی اپنی غیر محرف صورت میں ہیں۔ اسی کا اطلاق قصص الانبیاء پر بھی ہوتا ہے۔ قصص قرآنی میں کسی ایسے غیر اخلاقی، غیر منطقی عنصر کی آمیزش نہیں جس سے بائبل میں مذکورہ قصص آلودہ ہیں (۵۲)۔

(۳۴) سورۃ الاسراء میں مذکور احکام قرآنی (آیات ۲۲ تا ۲۹) اور توریت کے احکام عشرہ میں فرق کی ان فضلاء نے یہ شر انگیز تشریح کی ہے کہ محمدؐ رسول اللہ نے موسیٰ سے رقابت سے مغلوب ہو کر اور ان کو کمتر ثابت کرنے کے لئے یہ احکام پیش کئے۔ رسالت کا صحیح تصور نہ اختیار کرنے سے عقل کیسے مسخ ہوجاتی ہے مذکورہ بالا تاثر اسی کا شاخسانہ ہے۔

(۳۵) ان فضلاء کا یہ موقف بھی ہے کہ توریت کے احکام عشرہ کے بالمقابل سورۃ الاسراء میں مذکور احکام قرآنی میں مقامی رنگ کا عمل دخل ہے اور نزول قرآن مجید کے دور میں عرب معاشرے میں جو مسائل درپیش تھے، ان سے نبرد آزما ہونے کی

کوشش ملتی ہے مثلاً مفلسی کے خوف سے قتل اولاد کی ممانعت (آیت:۳۱)،قتل کے معاملے میں وارث کو قصاص یا دیت کا حق (آیت:۳۲)اور تکبر کی مذمت (آیت:۳۷) (۵۳)۔طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان نئے احکام کو قرآن مجید کی حقانیت یا ابدی پیغام سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو مقامی پس منظر کا زائیدہ قرار دے کر ان کی تضعیف کی گئی ہے۔

(۳۶)ان فضلاء کا دل آزار تجزیہ ہے کہ سورہ الاسراء میں توریت کے احکام عشرہ کی ترتیب نو بطور شارع اللہ کو متعارف کرنے اور قدیم عربی شاعری کے لوازمے کو چابک دستی کے ساتھ استعمال کرنے کے ذریعے محمدؐ رسول اللہ نے اپنے آپ کو بااختیار بنانے کی حکمت عملی اپنائی (۵۴)۔

(۳۷)ان فضلاء کی رائے میں سورہ الاسراء قرآن مجید میں نقطہ آغاز ہے موسیٰ سے محمدؐ رسول اللہ کی ہمسری بلکہ برتری کے دعویٰ کا اور اس کے بعد نازل شدہ سورتوں میں یہ رنگ اور گہرا ہو گیا ہے اور موسیٰ کا استخفاف نمایاں ہے۔ان کا الزام یہ بھی ہے کہ ہر چند اس سورہ میں موسیٰ کو عطا کردہ احکام عشرہ کو نقل کر دیا گیا ہے لیکن ان سے موسیٰؑ کی نسبت کو پردۂ خفاء میں رکھا گیا ہے اور احکام عشرہ کو وحی الٰہی سے منسوب کر دیا گیا ہے (۵۵)۔ان فضلاء کی یہ شر انگیز تفریق (وحی الٰہی اور موسیٰ اور محمدؐ رسول اللہ کے مابین) اسلام/قرآن مجید اور رسول اکرم سے ان کے بغض وعناد کی آئینہ دار ہے۔یہ نکتہ بھی کسی عجوبے سے کم نہیں کہ ۷۰/صفحات کو محیط سورہ الاسراء کی اس مغربی تفسیر میں محمدؐ رسول اللہ کا اسم گرامی ایک جگہ بھی نہیں آیا، ہر جگہ حوالہ محض ایک بے نام ''نقیب'' یا ''نامہ بر'' کا ہے۔ قرآن مجید اور سیرت طیبہ سے متعلق ۲۰۲۴ء میں مغربی تحقیق اور علم وفضل کے مظہر ۲۰۰۷ء یعنی گزشتہ ۱۷/سال سے جاری اس بظاہر عظیم الشان تحقیقی منصوبے کا یہ عالم ہے!

ایسے ظالم کا کیا کرے کوئی

★★★★

# حوالے اور حواشی

☆اس مقالے سے متعلق دو صراحتیں لازم ہیں:

(۱) ''نقل کفر کفر نہ باشد'' کے اصول کے تحت مستشرقین کے اسلام/قرآن مجید اور سیرت طیبہ سے متعلق انتہائی دل خراش، کفریہ جملے علمی ضرورت کے باعث نقل کئے گئے ہیں۔ان کی نقل میرے لئے اور ان کا مطالعہ قارئین کے لئے یقیناً سوہان روح ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ان اقوال کے اقتباس کے بغیر دفاع اسلام کا فریضہ انجام نہیں پاتا۔توقع ہے کہ قارئین اس سے درگزر کریں گے۔

(۲) مقالے میں جابجا بائبل اور قرآن مجید کے اقتباسات ان مصادر سے منقول ہیں:

(i) بائیل: کتاب مقدس، بنگلور، بائبل سوسائٹی آف انڈیا، ۲۰۱۵ء

(ii) قرآن مجید: قرآن کریم مع اردو ترجمہ وتفسیر از مولانا محمد جونا گڑھی، مدینہ، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، ۱۴۱۹ھ

(۱) یوحنا دمشقی (John of Damascus) اور قرون وسطی کے تعصبات اور اتہامات کو اس منصف مزاج مغربی فاضل نے دستاویزی شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔

Norman Daniel, Islam and the West: The Making An Image. Oxford, Oneworld, 1993.

یوحنا/یحییٰ دمشقی کی فتنہ پروری کے لیے ملاحظہ کریں:

عبدالرحیم قدوائی، ''یحییٰ دمشقی: اولین عیسائی سیرت نگار''، کتاب وحکمت، جولائی-ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ص ۸۱-۸۶

(۳) استشراق کی اس قابل نفریں روایت کی تاریخ کے لئے مطالعہ کریں:

-Matthew Dimmock, Mythologies of the Prophet Muhammad in Moderen English Culture, Cambridge, 2013

-John Tolan, Faces of Muhammad, Princeton, 2019

-Frederick Quinn, The Sum of All Heresies: The Image of Islam in Western Thought, Oxford, 2008

-Abdur Raheem Kidwai, Images of the Prophet Muhammad in English LiteratureNew York, 2018 .

-Muhammad Mustafa Al-Azami, The History of the Quranic Text, Leicester, 2003

-M. Mohar Ali, The Quran and the Orientalists. Norwich, UK, 2004 .

(۴) اس منصوبے سے متعلق تمام تفصیلات اور اس کے زیر اہتمام مطبوعات اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں: https://corpus coranicum.de/en/about

اس منصوبے کے تعارف کے لئے دیکھئے:

☆ عبدالرحیم قدوائی، ''کورپس قرآنکیم: قرآنیات سے متعلق مستشرقین کا حالیہ علمی محاذ''، مشمولہ عبدالرحیم قدوائی، اسلام اہل مغرب کی نظر میں، مرتب: رفیق احمد رئیس سلفی، علی گڑھ، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، ۲۰۲۳ء، ص ص ۴۱-۶۴۔

-Oliver Leaman" ,The Corpus Coranicum Project and the Issue of Novelty ,"Journal of Quranic Studies, 15:2) 2013 ,(142-148 .

(۵) اس کی تفصیل کے لئے یہ مقالے دیکھیں جن سے قرآن مجید کے متن کا استناد بذریعہ Carbon dating اور قرآن مجید کے اولین نسخوں سے ثابت ہے:

-عبدالرحیم قدوائی،''قرآن مجید کی صحت اور حفاظت :ایک دستاویزی تحقیق''،مشمولہ جہات قرآنیات ازعبدالرحیم قدوائی،علی گڑھ،ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی ۲۰۲۴ء،ص ص ۶۶-۷۲

-عبداللہ الخطیب اورعبدالرحیم قدوائی،''لائیڈن یونیورسٹی میں قرآن مجید کا قدیم مخطوطہ''،مشمولہ جہات قرآنیات ازعبدالرحیم قدوائی،حوالہ مذکورہ بالا ،ص ص ۷۳-۷۶

(6 )Corpus Coranicum Commentary Commentary Oview. Sura 17Translated and Analyzed by Dirk Hartwig and Angelika Neuwirth

(7)https//:corpuscoranicum.de/en

.Surah17 (Verse- navigator/sura/17,/P.16)مخفف

(۸)حواشی کی ابتداء میں بائبل کے اس ایڈیشن کے اشاعتی کوائف درج ہیں جن سے یہ اقتباسات منقول ہیں۔ہر اقتباس کا صفحہ نمبر قوسین میں درج ہے۔

(۹)Surah17 ،ص ۱۷

(۱۰)Surah17 ،ص ۱۷

(۱۱)Surah17 ،ص ۱۸

(۱۲)Surah17 ،ص ۱۸

(۱۳)Surah17 ،ص ۱۹

(۱۴)Surah17،ص ۲۴

(۱۵)Surah17،ص ۲۵

(۱۶)Surah17،ص ۲۵

(۱۷) کتاب مقدس،ص ۷۲

(۱۸) قرآن مجید،سورہ الاسراء،آیات ۲۲ تا ۳۹،اردو ترجمہ از محمد جوناگڑھی

(۱۹)Surah17،ص ۲۵

(۲۰) مقدس کتاب،ص ص ۶۸-۶۹

(۲۱)Surah17،ص ۲۸

(۲۲)عبدالرحیم قدوائی،''معذور افراد سے حسن سلوک''،مشمولہ جہات قرآنیات ازعبدالرحیم قدوائی،ص ص ۳۶-۴۴

(۲۳)Surah17،ص ۲۸

(۲۴) ایضاً،ص ۲۸

(۲۵) ایضاً،ص ۲۹
(۲۶) ایضاً،ص ۳۱
(۲۷) ایضاً،ص ۳۱
(۲۸) ایضاً،ص ۳۱
(۲۹) ایضاً،ص ۳۲
(۳۰) ایضاً،ص ۳۲
(۳۱) مقدس کتاب،ص ۵۸۹
(۳۲) Surah17،ص ۳۳
(۳۳) ایضاً،ص ۳۳
(۳۴) مقدس کتاب،ص ۵۳۲
(۳۵) Surah17،ص ۳۴
(۳۶)ان اور دیگر انگریزی تراجم قرآن پر محاکمے کے لئے دیکھئے:

* Abdur Raheem Kidwai, Bibliography of the Translations of the Meaning of the the Glorious Quran into English. : 1649-2002. Madina , Saudi Arabia, King Fahad Quran Printing Complex, 2007.

*Translating the Untranslatable: A Critical Guide to 60 English Translations of the Quran, NewDelhi,Sawrup and Sons.2011

* God's Ward, Man's Interpretations: A Critical Study of the 21st Century English Translations. New Delhi, Viva Books,2018.

(۳۷) Surah17،ص ۳۴
(۳۸) مقدس کتاب،ص ۶۰۵
(۳۹) Surah17،ص ۳۸
)۴۰(Heinrich Speyer,The Biblical Narratives in the Quran.Darmstadt,Germany
(۴۱) Surah17،ص ۴۰
(۴۲) مقدس کتاب،ص ۷۸۰

(۴۳) Surah17،ص ۴۱

(۴۴) ایضاً،ص ۴۴

(۴۵) ایضاً،ص ۴۴

(۴۶) ایضاً،ص ۴۶

(۴۷) مقدس کتاب،ص ۷۸۴

(۴۸) Surah17 ،ص ۴۶

(۴۹) ایضاً،ص ۴۹

(۵۰) ایضاً،ص ۴۹

(۵۱) ایضاً،ص ۵۳

(۵۲) بائبل اور قرآن مجید میں قصص انبیاء میں فرق اور قرآنی بیانیے کی منطقی پیش کش اور اخلاقی رفعت کے لئے دیکھئے:

☆ رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق کا اردو ترجمہ: بائبل سے قرآن تک، دیوبند حافظی بک ڈپو، ۱۹۹۳ء ، ۳ جلدوں میں

☆ عبدالرحیم قدوائی،''قصۂ یوسف توریت اور قرآن مجید میں: ایک موازنہ''، مشمولہ جہات قرآنیات، علی گڑھ، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، ۲۰۲۴ء، ص ص ۴۷-۶۵

☆ عبدالرحیم قدوائی،''حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت-بائبل اور قرآن میں''، تحقیقات اسلامی، اپریل-جون ۲۰۲۵ء، ص ص ۲۷-۴۶

☆ عبدالرحیم قدوائی،''بائبل اور قرآن مجید میں آدمؑ اور حوّا کے بیانیے: ایک موازنہ''، معارف، ستمبر ۲۰۲۵ء، ص ص ۵-۲۱

(۵۳) Surah17،ص ۵۶

(۵۴) ایضاً،ص ۵۸

(۵۵) ایضاً،ص ۶۵، ۶۶، ۶۷ اور ۶۸۔

▪ ▪ ▪

# قرآن مجید میں حصول جنت کی ترغیب

سیّد قطب شہید

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ o مَتَاعٌ قَلِیْلٌ قف ثُمَّ مَاْوٰئھُمْ جَھَنَّمُ . وَبِئْسَ الْمِھَادُ o لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ. وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ o (اٰل عمرٰن ۱۹۶-۱۹۸)

شہروں میں اہلِ کفر کی چلت پھرت سے دھوکے میں نہ آنا۔ یہ بس تھوڑا ہی فائدہ ہے۔ پھر اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور بہت بڑا گھوارہ ہے وہ۔ برعکس اس کے جن لوگوں نے اپنے رب کی نافرمانی سے بچتے ہوئے زندگی گزاری، اُن کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ سامانِ ضیافت اُن کے رب کے پاس سے۔ اور جو اللہ کے پاس ہے وہ (لذائذ دنیا سے) کہیں بہتر حق شناسوں کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِس طرح اُس جماعت کی تربیت کی جس کے سلسلے میں اُس نے طے کر رکھا تھا کہ زمین کی کنجیاں اور قیادت کی زمام اُس کے ہاتھ میں دے گا اور عظیم امانت اُس کے سپرد کرے گا۔ بعد اِس کے کہ وہ اپنی تمام خواہشات ومفادات سے کٹ گئے ہوں۔

شہروں اور ملکوں میں اہلِ کفر کی چلت پھرت اِس بات کی مظہر ہے کہ وہ نعمتوں سے مالا مال اور صاحبِ مرتبت واقتدار ہیں۔ یہ ایسی صورتِ حال ہے، جس سے دلوں میں لامحالہ خلش محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً اہلِ ایمان کے دلوں میں، جو تنگ دستی اور محرومی کی مشقت جھیل رہے اور اذیت، ظلم وستم اور جہاد کی زحمتیں اُٹھا رہے ہیں۔ اِس صورت حال سے غافل اور بے خبر عوام کے دل بھی متأثر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حق اور اہلِ حق زحمتوں اور مشقتوں سے دو چار ہیں اور اہلِ باطل نہ صرف یہ کہ اِن زحمتوں سے نجات پائے ہوئے ہیں، بل کہ خوش حالی کی زندگی گزار رہے ہیں (یہ صورتِ حال ان کے لیے فتنہ بن سکتی ہے)۔ پھر اِس صورتِ حال کا اثر خود گمراہ اہلِ باطل کے دلوں پر پڑتا ہے اور وہ ضلالت کبر وعناد اور شر اور فساد میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

### جاودانی نعمتیں اور اللّٰہ کا اعزاز

تب دلوں کو چھونے والی یہ آیت آتی ہے: لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ. مَتَاعٌ قَلِیْلٌ قف ثُمَّ مَاْوٰئھُمْ جَھَنَّمُط وَبِئْسَ الْمِھَادُ. (اٰل عمرٰن ۱۹۶-۱۹۷) شہروں میں اہلِ کفر کی چلت پھرت سے دھوکے میں نہ آنا۔ یہ بس تھوڑا ہی فائدہ ہے۔ پھر اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور بہت بُرا گھوارہ ہے وہ۔

تھوڑا سا سامان یا تھوڑا سا فائدہ جو جلد ختم ہو جائے گا، اِس کے بعد اُن کا دائمی وابدی ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا گھوارہ ہے (’مھاد‘ کے معنی بچھونے، گھوارے اور آرام کی جگہ کے ہیں۔ اِس میں شدید طنز ہے کہ اُن کے لیے اگر کوئی آرام کی جگہ ہے تو وہ دوزخ ہے۔مترجم)۔

## اس قلیل اور فانی و ناپائیے دار متاع کے مقابلے میں جنتیں (باغات) همیشگی اور اللہ کی جانب سے اعزاز و اکرام ہے

جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ. وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ. (اٰل عمرٰن ۱۹۸)

باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، سامانِ ضیافت اُن کے رب کی طرف سے۔ اور جو اللہ کے پاس ہے، وہ (لذائذِ دنیا سے) کہیں بہتر حق شناسوں کے لیے ہے۔

جو شخص اُس حصے (متاعِ دنیا) کو ایک پلڑے میں رکھے گا اور اِس حصے (جزائے اُخروی) کو دوسرے پلڑے میں رکھے گا، اُسے اِس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ متاعِ دنیا سے کہیں بہتر ہے اور وہ ’اَبرار‘ کے لیے ہے اور اس کے دل میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ متقین کا پلڑا کفار کے مقابلے میں کہیں جھکا ہوا ہے۔ ہر صاحبِ عقل اُسی حصے کو اپنا ناپسند کرے گا، جسے اولی الالباب اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

## صرف اُخروی وعدہ

تربیت اور اسلامی فکر کی بنیادی قدروں کو بیان کرنے کے موقع پر اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان سے فتح و نصرت کا وعدہ نہیں کر رہا، نہ یہ وعدہ کر رہا ہے کہ اُن کے دشمن مغلوب ہوں گے اور نہ یہ وعدہ کہ انھیں زمین میں غلبہ حاصل ہوگا۔ وہ اِس دنیا کی اشیا میں سے، جن کا دوسرے بہت سے مواقع پر وہ اُن سے وعدہ فرماتا ہے اور جنھیں وہ اپنے دوستوں کے لیے، اُن کے دشمنوں سے جنگ کے مواقع پر مقدر اور لازم قرار دیتا ہے۔ کسی بھی شے کا وعدہ نہیں کرتا۔

وہ یہاں اُن سے صرف ایک شے کا وعدہ کرتا ہے۔ اُس اجر کا جو اللہ کے پاس ہے۔ یہی اِس دعوت کی اصل اور بنیاد ہے اور

اِس عقیدے کی راہ پر چلنے کا اِسی پر انحصار ہے۔ ہر ہدف، ہر غایت اور ہر طمع سے کٹ کر صرف اجرِ آخرت کے لیے یکسوئی! یہاں تک کہ مومن کو یہ خواہش بھی نہ رہے کہ اِس عقیدے کو غلبہ، اللہ کے کلمے کو سر بلندی اور اللہ کے دشمنوں کو مغلوبیت نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ اِس خواہش سے بھی خود کو یکسو کر لیں، اپنے معاملے کو بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دیں اور اپنے دلوں کو اِس خواہش سے پاک کر لیں (بلاشبہ مومن سب کچھ رضائے الٰہی اور اجرِ آخرت کے لیے کرتا ہے، خواہ دنیا میں کچھ بھی نہ پا سکے۔ لیکن حق کے غلبے، باطل کی مغلوبیت اور اللہ کے کلمے کی سر بلندی کی خواہش فطری ہے، اِس سے دل کو پاک نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ مطلوب ہے۔ مترجم)۔

## اسلام ہر چیز کی قربانی کا نام

یہ عقیدہ سب کچھ قربان کرنے، عہد کو پورا کرنے اور ذمے داریوں کو ادا کرنے کا نام ہے۔ بغیر اِس کے کہ اِس کے معاوضے میں دنیا کا کوئی ساز وسامان مطلوب ہو اور بغیر اس کے کہ اُس کے عوض فتح ونصرت، غلبہ، تمکن فی الارض اور سر بلندی چاہیے ہو- ان سب کے بجائے ہر چیز صرف آخرت میں چاہنا ہے اور اس کا انتظار کرنا ہے۔

عقیدے کی ذمے داریوں کو اِس طرح ادا کرنے کے بعد فتح ونصرت حاصل ہوتی ہے اور تمکن فی الارض اور سر بلندی بھی نصیب ہوتی ہے، مگر یہ اللہ سے معاہدے میں داخل نہیں ہے اور نہ اُس سے کی ہوئی بیعت کا کوئی جز ہے۔ معاہدے اور بیعت میں



دنیا کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ یہاں تو ذمے داریوں کو ادا کرنا، عہد کو پورا کرنا، سب کچھ قربان کرنا اور آزمایشوں سے گزرنا ہے اور بس!

مکہ معظمہ میں اِسی پر بیعت اور دعوت کی بنیاد تھی اور اِسی پر اللہ سے بیع وشرا کا معاملہ ہوا تھا اور اللہ نے مسلمانوں کو نصرت، تمکن فی الارض اور سر بلندی سے اُسی وقت سرفراز کیا اور انھیں زمین کی کنجیاں اور انسانیت کی قیادت اُسی وقت بخشی، جب وہ آخرت کے لیے بالکل یکسو ہو گئے اور انھوں نے پوری طرح ایفائے عہد کیا۔

محمد بن کعب قرظی اور دوسرے اصحاب نے کہا کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے بیعت عِقبہ کی رات میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: آپ اپنے رب اور اپنی ذات کے لیے ہم سے جو چاہے عہد لے لیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جب کہ اوس اور خزرج کے نمائندے نبی صلی ﷺ سے آپؐ کی ہجرت کے لیے بیعت کر رہے تھے) میں اپنے رب کے لیے اِس بات کا عہد لیتا ہوں کہ تم اس

کی بندگی کروگے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے اور اپنے لیے یہ عہد لیتا ہوں کہ جس طرح تم اپنی جان اور مال کی حفاظت کروگے، اسی طرح میری حفاظت کروگے۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا: ہم یہ سب کچھ کردیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت''۔ انھوں (انصار کے ذمے داروں) نے کہا: سودا نفع بخش ہے۔ ہم نہ اِس معاہدے کو خود فسخ کریں گے اور نہ اُسے فسخ کرنے کا مطالبہ کریں گے۔

جی ہاں جنت اور صرف جنت! فتح ونصرت، عزت وحدت، قوت، تمکن فی الارض، قیادت، دولت اور خوش حالی، یہ سب چیزیں جو اللہ نے انھیں بخشیں اور ان کے ہاتھوں میں دیں، اُن کا اللہ تعالیٰ نے تذکرہ نہیں کیا کیوں کہ یہ چیزیں معاہدے سے خارج تھیں۔

یہی بات تھی جو اوس اور خزرج کے نقبا نے کہی: سودا نفع بخش ہے۔ ہم اُسے نہ خود فسخ کریں گے اور نہ آپ ﷺ سے اسے فسخ کرنے کا مطالبہ کریں گے۔

## اُمت کی تربیت

اللہ تعالیٰ نے اِس طرح اُس جماعت کی تربیت کی جس کے سلسلے میں اُس نے طے کر رکھا تھا کہ زمین کی کنجیاں اور قیادت کی زمام اُس کے ہاتھ میں دے گا اور عظیم امانت اُس کے سپرد کرے گا۔ بعد اِس کے کہ وہ اپنی تمام خواہشات ومفادات سے کٹ گئے ہوں۔ یہاں تک کہ اُن خواہشات سے بھی، جو اُس دعوت سے متعلق تھیں، جس کے وہ حامل تھے۔ اُس نظام سے متعلق تھیں، جسے وہ برپا کر رہے تھے۔ اُس عقیدے سے متعلق تھیں، جس کے لیے وہ جان دے رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس امانت کبریٰ کے حامل وہی لوگ ہوسکتے ہیں، جن کی اپنی ذات کے لیے کوئی خواہش باقی نہ رہی ہو۔ اِس صورت میں وہ اللہ کی اطاعت (سِلم) میں پوری طرح داخل ہوسکتے ہیں۔ (فی ظلال القرآن، ج ۲، ترجمہ: سید حامد علی، ص ۴۹۶-۵۰۰)

. . .

# اسماء القرآن

ہدایت اللہ خاں

کسی کتاب کا تعارف اُس کے نام سے بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ نام اُس کے موضوع کا عکاس ہوتا ہے اور اکثر موضوع کے عنوان سے بھی کتاب کا نام رکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نام اُس کتاب کی جہاں وضاحت کر رہا ہوتا ہے وہاں اُس کی صفات سے متصف بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ایک مصنف اپنی کتاب کا نام رکھتا ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب کے مختلف 'اسما' قرآن مجید میں بیان کیے ہیں۔ قرآن اللہ کی تصنیف نہیں بل کہ تنزیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانیت کی خیر خواہی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے جتنے بھی اسما خود قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسما قرآن کی مختلف صفات کی توضیح کر رہے ہیں، مثلاً قرآن کی یہ صفت ہے کہ وہ راہِ ہدایت ہے تو قرآن کو 'ہدیٰ' کہا اور فرمایا: هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ قرآن کی ایک صفت کہ یہ نصیحت ہے لوگوں کے لیے تو قرآن کو 'ذکر' کہا اور فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۹)۔ قرآن کی ایک اور صفت ہے کہ یہ حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کتاب ہے، تو قرآن کو 'فرقان' کہا اور فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا. (الفرقان:۱)۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے اور یہ بھی اُس کی صفت ہے۔ اِسی لیے قرآن کو تنزیل کہا اور فرمایا کہ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. (الزمر:۲)۔ غرض قرآن کے جتنے بھی اسما ہیں تمام قرآن کی مختلف صفات کو بیان کر رہے ہیں۔

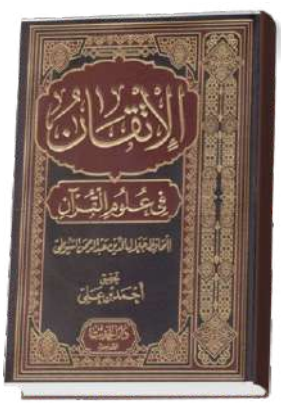


قرآن کے کُل کتنے اسما ہیں؟ اس بارے میں علما کے مختلف اقوال ذکر ہوئے ہیں۔ کسی نے قرآن کے ۵۵ / اسما ذکر کیے ہیں تو کسی نے ۸۸ / اور کسی نے ۹۰ / نام شمار کیے ہیں۔ مگر اِس حوالے سے اکثر علما کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ قرآن کے اصل نام صرف پانچ ہیں، باقی اُس کے صفاتی نام ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں ابوالمعالی کے حوالے سے ۵۵ / نام بحوالہ آیات ذکر کیے ہیں۔ علامہ ابوالحسن حرالیؒ نے قرآن کے ۹۰ / سے کچھ زیادہ نام ذکر کیے ہیں، لیکن بدرالدین زرکشیؒ نے صحیح فرمایا کہ ان میں اکثر نام دراصل قرآن کی صفات ہیں، اعلام نہیں۔ امام فخرالدین رازیؒ نے بھی ۵۵ / ناموں میں سے ۳۲ / نام تشریح کے ساتھ نقل فرمائے ہیں۔

محمد بن جریر الطبریؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب کو چار نام دیے ہیں۔ ان میں سے ایک نام القرآن ہے، دوسرا الفرقان، تیسرا الکتاب اور چوتھا الذکر ہے۔ ابن عطیہ غرناطیؒ نے بھی یہی چار نام ذکر کیے ہیں، اور علامہ زرقانی نے چار پر التنزیل کے نام کا اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کے یہی پانچ نام ہیں۔ لہٰذا قرآن کے اصل نام پانچ ہیں: ۱- القرآن ۲- الذکر

۳-الکتاب ۴-التنزیل ۵-الفرقان۔اس کے علاوہ جتنے بھی نام ہیں وہ سب صفاتی نام ہیں۔اس قول کی مزید وضاحت علامہ محمد علی الصابونی نے فرمائی ہے اور القرآن، الذکر، الکتاب، التنزیل، الفرقان کو اسم کہا ہے اور دیگر اسما کو صفات کہا ہے۔اس حوالے سے مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ علامہ ابوالمعالیؒ نے قرآن کریم کے ۵۵/نام شمار کیے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کی تعداد ۹۰/سے متجاوز بتائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی صفات، مثلاً مجید، کریم، حکیم وغیرہ کو نام قرار دے کر تعداد اس حد تک پہنچا دی ہے۔ورنہ صحیح معنوں میں قرآن کریم کے نام کُل پانچ ہیں: القرآن، الفرقان، الذکر، الکتاب اور التنزیل۔خود قرآن کریم نے اپنے لیے یہ پانچوں الفاظ اسم علم کے طور پر ذکر فرمائے ہیں۔مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے کُل اسما پانچ ہیں۔

سب سے پہلے ان اسمائے خمسہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور ان کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔چنانچہ یہاں پہلے اِن اسمائے خمسہ کو بیان کیا جائے گا اور بعد میں بقیہ اسما کے علوم و معارف پر بھی بحث کی جائے گی۔

## القرآن

قرآن کے تمام ناموں میں بالعموم اور ان مذکورہ بالا پانچ ناموں میں بالخصوص سب سے زیادہ مشہور نام ُالقرآن، ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی ۳۶/سورتوں کی ۶۵/آیات میں ہوا ہے، مثلاً:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ: ۱۸۵) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (النساء: ۸۲) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل: ۹)

قرآن کو قرآن کیوں کہتے ہیں؟ اِس لفظ کے دو معنی ہیں: ۱-جمع کرنا، ۲- پڑھنا۔اس بارے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ یہ ُقرنت، سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ُجمع کرنا، جوڑنا۔بعض نے اسے ُالقریٰ، سے مشتق قرار دیا اور اس کے معنی بھی جمع کرنا ہیں۔بعض اسے ُقرائن، کا مشتق بتاتے ہیں۔اس حوالے سے اس مفہوم کی صحیح ترجمانی اور وضاحت مشہور تابعی ُقتادہ بن دعامہ سدوسیؒ (م: ۱۱۷ھ) کا قول ہے۔ان کے نزدیک قرآن ُق-ر-ئ، سے ماخوذ ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ قرءت الشّی (میں نے اس چیز کو جمع کیا)۔اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ چوں کہ قرآن کی سورتیں اور آیات جمع ہیں اور آپس میں مربوط و یک جا ہیں اور اس سے قبل، یعنی نزول سے پہلے لوح محفوظ میں بھی وہ یک جا اور جمع تھیں، لہٰذا اس بنا پر قرآن کو ُجمع، کہا جائے گا۔

## قرآن بمعنی پڑھنا

قرآن کے دوسرے معنیٰ ُپڑھنے، کے ہیں اور اس بارے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال آئے ہیں۔حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے قول کے مطابق القرآن کا مادہ یا اصل ُق-ر-ئ، ہے اور یہ ُفعلان کے وزن پر مصدر کا صیغہ ہے جس کے معنیٰ ہیں ُپڑھنا، مثلاً غفران، ُخسران، ُکفران وغیرہ۔خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن ُپڑھنے، کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۔اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (الإسراء: ۷۸) اور فجر کے وقت قرآن پڑھو، بے شک فجر

کی قراءت میں فرشتے حاضر کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت میں 'قرآن الفجر' سے مراد نماز فجر کی قراءت ہے۔ایک اور مقام یعنی سورۂ قیامہ میں تو بالکل واضح انداز میں یہ معنیٰ فرمایا ہے۔فرمایا: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (القیامۃ:۱۷-۱۸) اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے، جب ہم پڑھا کریں تو تم (اُس کو سنا کرو اور) پھر اُسی طرح پڑھا کرو۔ یہاں دونوں آیات میں، قرآن قراءت یعنی پڑھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب چوں کہ پڑھنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے، اس لیے اس کا نام 'قرآن' ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامہ:۱۷) بلاشبہ اس (کتاب) کا جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ہی ذمے ہے۔ پھر عربی زبان میں کبھی کبھی مصدر کو اسم مفعول کے معنی میں استعمال کرلیا جاتا ہے۔کلام اللہ کو 'قرآن' اِسی معنیٰ میں کہا جاتا ہے، یعنی پڑھی ہوئی کتاب۔کتاب اللہ کا یہ نام کفارِ عرب کی تردید میں رکھا گیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (حم السجدہ:۲۶) اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو۔ اِن کفار کے علی الرغم 'قرآن' نام رکھ کر اشارہ فرما دیا گیا کہ قرآن کریم کی دعوت کو ان اوچھے ہتھکنڈوں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ کتاب پڑھنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور قیامت تک پڑھی جاتی رہے گی۔ چنانچہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم ساری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

**الفرقان**

فرقان کا مادّہ یا اصل 'ف-ر-ق' ہے اور اس کے معنی ہیں: دو چیزوں کے درمیان تمیز، فرق اور جدائی کرنا اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنا۔جب یہ معنیٰ کلام اللہ کے ساتھ خاص ہوں گے تو معنی ہوگا-حلال و حرام، سچ وجھوٹ، حق و باطل، معروف ومنکر، نیکی و بدی، نفع ونقصان کے درمیان فرق، یعنی امتیاز اور جدائی کرنا۔قرآن کا مقصدِ نزول بھی صرف یہی تھا کہ انسان ان دونوں راستوں کو پہچان جائے اور ان میں واضح فرق کو محسوس کرتے ہوئے اچھی باتوں کو اختیار کرے اور برے کاموں سے خود کو دُور رکھے۔اسی طرح قرآن کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام 'فرقان'، رکھا، یعنی کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کی کسوٹی۔علامہ ابن جریر طبریؒ نے فرمایا کہ قرآن کو فرقان کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ اپنی دلیلوں، حدود، فرائض اور اپنے حکم کی ساری وجوہات کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے۔امام بدرالدین محمد بن عبداللہ الزرکشی اپنی کتاب البرھان فی علوم القرآن میں فرقان کے معنی کے تحت فرماتے ہیں کہ قرآن کا نام فرقان اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ حق و باطل، مسلمان و کافر، مومن ومنافق کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے۔ اِسی وجہ سے حضرت عمرؓ ابن خطاب کو 'فاروق' کہا جاتا تھا کہ وہ حق و باطل کے درمیان واضح فرق فرماتے تھے۔

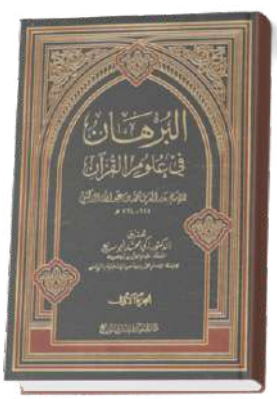

علامہ جوہری (م: ۳۹۳ھ) اور علامہ ابن منظور افریقی نے لکھا ہے کہ ''فرقان ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی ہو،،۔ فرقان کے ایک معنیٰ نصرۃ بھی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا (الانفال:۲۹)

اے ایمان والو! اگر تم گناہوں سے پرہیز کروگے تو اللہ تم کو فیصلہ کن فتح دے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت مجاہدؒ سے فرقان کے معنیٰ مخرج یعنی کسی پریشانی سے نکلنے کا راستہ بھی منقول ہے۔

مولانا مالک کاندھلوی نے تفسیر کبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام رازیؒ نے عکرمہؒ اور سدیؒ کا قول فرقان کے بارے میں نجات کے معنوں میں بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح 'فرقان، فراست اور دانش مندی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، تاہم علامہ ابن جریر طبریؒ نے لکھا ہے کہ یہ سارے معنیٰ 'متقاربہ، ہیں، یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

**الکتاب**

اسمائے خمسہ میں سے تیسرا نام الکتاب ہے جسے عام طور پر کتاب ہی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اصل یا مادّہ 'ک-ت-ب، یعنی کَتَبَ ہے۔ کلام اللہ کے حوالے سے سب سے زیادہ مشہور نام تو 'قرآن، ہی ہے لیکن اس کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور مشہور ہے وہ 'کتاب، ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر کلام اللہ کو صرف دو ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے یا تو کہنے والا 'قرآن، کہتا ہے یا 'کتاب،۔ اس کو کتاب اللہ کے نام سے بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: الٓمّٓ o ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ، ا، ل، م، یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس آیت کا ایک اور طریقے سے بھی ترجمہ کیا جاتا ہے وہ اس طرح کہ ''اِس (بات) میں کوئی شک نہیں کہ یہ (قرآن) الکتاب ہے،،۔ جمہور اہلِ علم نے 'الکتاب، کو اختیار کیا ہے۔ الکتاب، چوں کہ اس کا مصدر 'کتب، ہے اور 'کتب، کے تین معنیٰ آتے ہیں: ۱-لکھنا ۲-جمع کرنا ۳-فرض کرنا، مقرر کرنا۔ اگر ہم پہلے والے معنیٰ کو لیں تو یہ غلط نہیں ہوگا، اگرچہ قرآن مجید تورات کی طرح لکھا ہوا نازل تو نہیں ہوا لیکن نزول سے قبل لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا تھا اور نزول کے بعد حضورؐ نے اپنی نگرانی میں کاتبانِ وحی سے لکھوایا تھا۔ اسی وجہ سے اسے 'کتاب، کا نام دیا گیا، یعنی وہ کلامِ الٰہی جو لکھنے اور پڑھنے کے لیے نازل ہوا۔

**کتاب بمعنی جمع کرنا**

کتاب کے دوسرے معنیٰ جمع کرنا کے بھی آئے ہیں کیوں کہ 'کتب، کے معنیٰ میں 'جمع کرنا، بھی ہیں اور اسی سے لشکر کا نام 'کتیبہ، موسوم ہوا ہے۔ بخاری میں ہے کہ ثقیفہ بنو ساعدہ کے انتخابی اجلاس میں خطیب الانصار نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ نَحْنُ کَتِیبَۃُ الاِسلَامِ (ہم اسلام کا لشکر ہیں)۔ مولانا گوہر رحمن نے علامہ سیوطیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ قرآن کو کتاب کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مختلف قسم کے علوم، قصص اور اخبار کو موثر ترین طرز پر جمع کیا گیا ہے اور کتاب لغت میں جمع کرنے کو کہا جاتا ہے (علوم القرآن، ج ۱، ص ۵۰)۔ علامہ زرکشیؒ نے بھی کتاب کے معنیٰ جمع کرنے کے بتائے ہیں۔

### کتاب بمعنی فرض و وجوب اور حکم و فیصلہ

کتاب کا لفظ کبھی فرض و وجوب اور حکم و فیصلے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً: کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں)، کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے)، کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ (تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے)، کِتَابًا مَّوۡقُوۡتًا (مقررہ وقت)۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے ایک بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس آیت میں ذکر کے معنی شرف، یعنی عزت کے بیان کیے ہیں کہ یہ قرآن بڑی عزت والی کتاب ہے اور اسی وجہ سے تمھاری عزت ہے کہ قرآن تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اسی لیے ہمیں تمام اُمتوں پر فضیلت بھی دی گئی کہ ہمارے پاس قرآن مجید، یعنی اللہ کی سب سے زیادہ عزت والی کتاب موجود ہے۔

ان تمام مثالوں میں کتب کا مطلب فرض لیا گیا ہے۔ علامہ جوہریؒ نے الصحاح میں اور علامہ ابن منظور افریقیؒ نے لسان العرب میں 'کتب' کے معنیٰ 'الفرض والحکم' ذکر کیے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے ایک شادی شدہ عورت کے رجم کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ لَاقۡضِیَنَّ بَیۡنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰہِ، میں تمھارے درمیان کتاب پر فیصلہ کروں گا (بخاری)۔ اس حدیث میں کتاب اللہ دراصل حکم اللہ کے معنوں میں آیا ہے۔ اس لیے کہ رجم کا حکم قرآن میں مذکور نہیں ہے مگر چونکہ وَمَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی) کی بنا پر رسولؐ اللہ کا حکم، اللہ کا حکم ہے، اس لیے آپؐ نے اپنے حکم کو اللہ کی کتاب، یعنی اللہ کا حکم قرار دیا۔ سابقہ آسمانی کتابوں کو بھی کتاب کہا گیا ہے، مثلاً وَاٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَجَعَلۡنٰہُ (بنی اسرائیل ۱۷:۲)، وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ (الجاثیہ:۱۶)، یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (مریم ۱۹:۱۲)۔

خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کو قرآن میں مختلف مقامات پر 'کتاب' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ ان تمام معنوں پر غور کرتے ہوئے 'کتاب' کا جامع معنیٰ ہوگا کہ 'یہ اللہ کا حکم اور قانون ہے اور اس کے احکام و فرائض کا مجموعہ ہے'۔

### الذکر

کلام اللہ کے اسمائے خمسہ میں سے چوتھا نام الذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو 'ذکر' کا نام بھی دیا ہے، اور قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ خود قرآن کو 'ذکر' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ 'ذکر' اصل، یعنی مادہ 'ذ-ک-ر' ہے۔ اس کے معنیٰ کے بارے میں مختلف اقوال آتے ہیں۔ عام طور پر اس کے تین معانی بیان کیے جاتے ہیں۔ کسی نے اس کے معنیٰ 'یاد دہانی' لکھا تو کسی نے 'تذکرہ اُمت سابقہ' بیان کیا ہے اور کسی نے اس سے مراد 'شرف و عزت' لیا ہے۔

### ذکر بمعنٰی یاددھانی

ذکر کے معنیٰ کبھی یاد دہانی، نصیحت اور یادداشت کے معنوں میں بھی آتے ہیں۔ قرآن کو ذکر اس معنوں میں کہنے کی وجہ یہ

ہے کہ یہ انسان کے لیے نصیحت اور رہنمائی ہے۔ابن درید ازدیؒ،علامہ جوہریؒ اور علامہ ابن منظور افریقیؒ ان تینوں ائمہ لغت نے لکھا ہے کہ ذکر، ذکریٰ اور ذُکرہ نسیان کی ضد ہے۔علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی نے ذکر کے معنیٰ 'نصیحت' بیان کیے ہیں۔یعنی یہ کتاب لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے اور اُن کو آخرت کی فکر اپنے دلوں میں اُجاگر کرنے کے لیے نصیحت، یعنی یاد دہانی ہے۔درحقیقت انسان اگر اس نصیحت پر عمل کرے تو لازماً وہ کامیابی کی منازل طے کرتا ہوا اللہ کی رضا کا حق دار ٹھیرایا جائے گا۔خود قرآن مجید میں قرآن کو نصیحت کہا اور فرمایا کہ ''ص،قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی،،۔(ص:۱)

## ذکر بمعنٰی تذکرہ اُمتِ سابقہ

ذکر کے معنی اس حوالے سے کہ یہ تذکرہ ہے اُمت سابقہ کا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اُمت سابقہ،کتب سابقہ اور انبیاے سابقین کے حالات وواقعات اور ان کے احکام کی مکمل یاد داشت ہے۔قرآن میں اُن کے وہ تذکرے شامل ہیں جن کو انھوں نے تبدیل کر دیا تھا۔قرآن میں اِن کی وہ تعلیمات موجود ہیں کہ جس کو اُنھوں نے اپنی خواہشات نفس کی وجہ سے اپنی کتابوں سے نکال دیا تھا۔سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے اُن کو تبلیغ کی گئی کہ یہ کتاب تو اُن کتابوں کی تصدیق کرتی ہے،لہٰذا اِس پر ایمان لاؤ۔ ذکر کو مھیمن کے معنی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے،کیوں کہ مھیمن کا مطلب ہے نگران اور محافظ۔نگران اور محافظ اس لیے کہا کہ قرآن میں سابقہ اُمتوں کے حال محفوظ ہیں۔ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ ھیمنہ کے اصل لغوی معنی ہیں حفاظت کرنا اور نگرانی کرنا۔مولانا مودودیؒ نے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''قرآن کو الکتاب کا محافظ و مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کتب ِآسمانی میں دی گئی تھیں اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔اب ان کی تعلیمات ِبرحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا،،۔(سورۂ مائدہ:۴۸)

## ذکر بمعنٰی شرف وعزت

ذکر کے معنی کبھی مدح وتعریف،شہرت وعظمت اور شرف کے بھی آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن مدح وتعریف کے لائق ہے،شہرت کا حامل ہے اور عظمت وشرف،یعنی عزت وافتخار والا اور بزرگی والا ہے۔ائمہ لغت نے اپنی کتابوں میں ذکر کے معنیٰ'الصیّت'،یعنی شہرت 'الثناء'یعنی مدح وتعریف،'الشرف'یعنی عظمت وعزت بیان کیے ہیں۔اگر ذکر کے معنیٰ'الصیّت'،یعنی شہرت لیں تو بھی درست ہوگا کیوں کہ قرآن خود بھی شہرت والا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو،قرآن سے تعلق رکھنے والوں کو بھی شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔چونکہ اس کتاب میں جتنے بھی احکام آئے ہیں وہ سب کے سب انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں،لہٰذا یہ کتاب انسانیت کے لیے بہترین کتاب ہے۔جس کتاب میں اتنی خصوصیات ہوں تو وہ لائق تعریف ہے۔جتنی فضیلت اس کتاب کی بیان ہوئی ہے اور جتنی اس کتاب میں ہے،اس کتاب سے پہلے نہ کسی کتاب کی فضیلت بیان ہوئی اور نہ کسی کتاب میں اس جیسے فضائل موجود ہیں۔اگر ذکر کے معنیٰ'الشرف'لیں تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کریم چوں کہ عظمت وشرف اور برکت ورفعت کا گنجینۂ بے بہا ہے اور جو لوگ ایمان لاکر اس پر عمل کرتے ہیں،اللہ تعالیٰ اُن کو عظمت و رفعت اور برکت وشرف کی دولت سے مالا مال

کر دیتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ زخرف میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (سورۃ الزخرف: ۴۳)، ''حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمھارے لیے اور تمھاری قوم کے لیے ایک بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی''۔ اس آیت میں ذکر کے معنی شرف، یعنی عزت کے بیان کیے ہیں کہ یہ قرآن بڑی عزت والی کتاب ہے اور اسی وجہ سے تمھاری عزت ہے کہ قرآن تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اسی لیے ہمیں تمام اُمتوں پر فضیلت بھی دی گئی کہ ہمارے پاس قرآن مجید، یعنی اللہ کی سب سے زیادہ عزت والی کتاب موجود ہے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ

> ''یعنی اس سے بڑھ کر کسی شخص کی کوئی خوش قسمتی نہیں ہوسکتی کہ تمام انسانوں سے اُس کو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب نازل کرنے کے لیے منتخب کرے، اور کسی قوم کے حق میں بھی اِس سے بھی بڑی کسی خوش قسمتی کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی دوسری سب قوموں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اُس کے ہاں اپنا نبی پیدا کرے اور اُس کی زبان میں اپنی کتاب نازل کرے اور اُسے دنیا میں پیغام خداوندی کی حامل بن کر اُٹھنے کا موقع دے۔ اس شرفِ عظیم کا احساس اگر قریش اور اہلِ عرب کو نہیں ہے اور وہ اس کی ناقدری کرنا چاہتے ہیں تو ایک وقت آئے گا جب اُنھیں اِس کی جواب دہی کرنی ہوگی''۔ (ترجمۂ قرآن مجید، سورۂ زخرف، آیت ۴۴، حاشیہ ۷)۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ بڑی عزت کا مقام ہے کہ عرب میں قرآن نازل ہوا، لہٰذا لوگوں پر لازم تھا کہ وہ فوری طور پر اس پر ایمان لے آتے۔ چوں کہ وہ ایمان نہیں لائے، یعنی اس عزت مند کلام کی توقیر نہیں کی، لہٰذا اس بے قدری کا حساب قیامت کے دن دینا ہوگا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ''یہ کتاب شرف و عزت والی بھی ہے اور نصیحت و یاد دہانی کے مضامین پر مشتمل ہے''۔ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ 'الذکر' کا لفظ نصیحت، یاد دہانی اور یاد داشت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور شرف و عظمت اور شہرت و رفعت کے معنوں میں بھی آتا ہے اور قرآن اِن دونوں صفات کا حامل ہے، اسی لیے اس کو ذکر کا نام دیا گیا ہے۔ علامہ ابن جریر طبریؒ ذکر کی وجہِ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''الذکر نام رکھنے کی توجیہ میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ قرآن اللہ کی جانب سے نصیحت ہے جس کے ذریعے اُس نے اپنے بندوں کو یاد دہانی کرائی ہے اور اس میں اُن کو اپنے حدود و فرائض اور دوسرے حکم و مصالح سمجھائے ہیں، اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے نیک نامی، شرف، رفعت اور فخر کا ذریعہ ہے جو اِس پر ایمان لائے ہوں اور جنھوں نے اس کے احکام و ہدایات کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے شرف ہے''۔

ابن عطیہ غرناطیؒ نے اس نام کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔ قرآن کا نام ذکر اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان کی آخرت، ان کا معبود اور ہر چیز یاد دلائی ہے جس سے وہ غافل تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں گذشتہ قوموں اور گذشتہ انبیا کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب محمدؐ، اِن کی قوم اور اس کا علم

رکھنے والے سارے علما کے لیے شرف و رفعت کا موجب ہے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

''یعنی اس میں کوئی خواب وخیال کی باتیں تو نہیں ہیں، تمھارا اپنا ہی ذکر ہے، تمھاری ہی نفسیات اور تمھارے ہی معاملاتِ زندگی زیرِ بحث ہیں، تمھاری ہی فطرت و ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے، تمھارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چُن چُن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، اور تمھارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور قبائح کا فرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمھارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمھاری عقل عاجز ہو،، (ترجمۂ قرآن مجید، سورۂ انبیا، آیت ۱۰، حاشیہ ۲)۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کو ذکر اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں نصیحت ہے اور سابقہ اُمتوں کے احوال ہیں اور ذکر کے معنی شرف بھی ہیں۔ پھر 'شرف' کی دلیل سورۂ زخرف کی آیت نمبر ۴۴ سے دیتے ہیں۔ مولانا گوہر رحمن نے لکھا ہے کہ ''زیادہ مشہور اور متبادر توجیہہ یہی ہے کہ یہ کتاب انسان کو زندگی کا مقصد، یعنی عبادت و بندگی اور آخرت یاد دلاتی ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہے''۔ (علوم القرآن، ج ۱، ص ۵۴)

## التنزیل

اسمائے خمسہ میں سے پانچواں اور آخری نام 'التنزیل' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر قرآن کو تنزیل کہا ہے، مثلاً:

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (السجدہ: ۲)، تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (الزمر: ۱)،
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (المومن: ۲)

وجہ تسمیہ: اس نام کی وجہ تسمیہ تو اس کے معنی سے ہی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، یہ کسی مصنف کی تحریر نہیں ہے اور نہ یہ کسی شاعر کا ہی کلام ہے اور نہ کسی ملک یا علاقے کا دستور ہے بل کہ یہ تو رب العالمین کا نازل کردہ وہ قانون ہے کہ جس میں انسانیت کی بھلائی کا سامان جمع ہے۔ تنزیل کا مطلب ہے 'نازل کردہ کتاب' اور اس معنی سے بھی معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔ دنیا کی کتابوں اور نازل کردہ کتاب میں وہی فرق ہے کہ جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ کے کلام کی فضیلت دوسرے تمام کلاموں پر ایسی ہے جیسا خود اللہ تعالیٰ کی برتری اُس کی مخلوق پر ہے،،۔ کہا گیا ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام، یعنی بادشاہوں کی باتیں، باتوں کی بادشاہ ہوتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے لہٰذا اس کا کلام تو تمام کلاموں پر افضل اور اعلیٰ ہوگا۔ ابن جریر طبریؒ اور علامہ ابن عطیہ غرناطیؒ نے التنزیل، کو اسماء القرآن میں شامل نہیں کیا ہے لیکن محمد عبد العظیم الزرقانی نے اپنی کتاب مناہل العرفان فی علوم القرآن میں تنزیل کو قرآن کریم کا پانچواں نام قرار دیا ہے۔ علامہ زرکشیؒ نے اپنی کتاب البرہان فی علوم القرآن میں تنزیل کو اسماء القرآن میں لکھا ہے کہ یہ منزل من اللہ ہے اور جبریلؑ کے ذریعے نازل کی گئی ہے۔

# سنت اور صاحب سنت

# حدیث: اصول، تخریج، تدریس

فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

تمام اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے؛ چنانچہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا ''ترکت فیکم شیئین لن تضلوا ابعدھما کتاب اللہ و سنتي'' [1] ان دونوں مصادر شریعت میں سے جہاں کتاب اللہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ استناد کے اعلیٰ ترین مقام پر ہے اور اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ'' (الحجر: ۹) اور جس کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کی خود قرآن مجید نے صراحت کی ہے ''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ'' (البقرۃ: ۲) وہیں حدیث کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ قرآن مجید کا بیان اور شریعت اسلامی کی توضیح و تفسیر ہے؛

> حدیث کی نقل و روایت کی خدمت اس کے ابتدائی عہد میں جس طرح عربوں نے کی، اسی طرح اس کے جمع و تدوین اور اس فن کو اوجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ایرانی نژاد علماء کے حصہ میں آیا، پھر مصر و شام اور فلسطین و یمن کے علاقوں سے اُٹھنے والے اہل علم نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا ہے، اسی طرح ہندستان کو جزیرۃ العرب سے دور دراز کا علاقہ ہے؛ لیکن اسے یہ شرف حاصل ہے۔

اسی لئے امام اوزاعیؒ نے فرمایا: ''الکتاب أحوج إلی السنة من السنة إلی الکتاب'' حدیث کی اسی اہمیت کی وجہ سے اسے ہر عہد کے اصحابِ نظر علماء اور محققین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے اور دوسری صدی ہجری سے لے کر موجودہ صدی تک کوئی عہد ایسا نہیں گذرا، جس میں حدیث کے مختلف پہلوؤں پر، اس عہد کی ضرورتوں کے مطابق بہت سی تصنیفات منظر عام پر نہیں آئی ہوں، روایت و تدریس اور تصنیف و تحقیق غرض ہر پہلو سے اس فن کی ایسی عظیم الشان خدمت کی گئی ہے کہ اس کو رسول اللہ کے معجزہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا نظام یہ رہا ہے کہ جن مذہبی کتابوں سے اب انسان کی ہدایت متعلق نہیں رہی، وہ محفوظ نہیں رہیں اور وہ انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں کا شکار بن گئیں، اسی طرح ان مذہبی پیشواؤں کی سیرت بھی اپنی حقیقی حالت میں آج موجود نہیں ہے، یہاں تک کہ جن پیغمبروں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور جن پر ہمارا ایمان ہے، ان کی زندگی کے بھی محض چند واقعات آج روشنی میں ہیں؛ بلکہ اگر قرآن مجید میں ان کا ذکر نہ ہوتا، تو تاریخی طور پر ان کی تصدیق بھی دشوار ہوتی؛ لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے اور قیامت تک انسانیت آپ ہی کے نبوت کے سایہ میں رہے گی، اس لیے من جانب اللہ آپ کی پوری

زندگی تاریخ کی روشنی میں ہے اور آپ کے فرمودات ومعمولات اس طرح محفوظ ہیں کہ زندگی کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں ہے، اس لیے حدیث کی حفاظت دراصل قرآن کی حفاظت اور رسول اللہ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے۔

حدیث کی نقل وروایت کی خدمت اس کے ابتدائی عہد میں جس طرح عربوں نے کی، اسی طرح اس کے جمع وتدوین اور اس فن کو اوجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ایرانی نژاد علماء کے حصہ میں آیا، پھر مصر وشام اور فلسطین ویمن کے علاقوں سے اُٹھنے والے اہل علم نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا ہے، اسی طرح ہندستان گو جزیرۃ العرب سے دور دراز کا علاقہ ہے؛ لیکن اسے یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت عمر کے ابتدائی عہد میں ہی یہاں سے اہل ایمان کا قافلہ حجاز مقدس پہنچ چکا تھا اور بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہی ہندستان کے ساحلی علاقہ پر اسلام کی روشنی پہنچ گئی تھی، اس دیار نے جہاں مختلف اسلامی اور عربی علوم کی خدمت کی ہے، وہیں حدیث نبوی کی خدمت میں بھی اس کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

برصغیر کا علم حدیث سے قدیم رابطہ رہا ہے، یہاں حضرت عمر کے عہد سے ہی صحابہ اور تابعین کا ورود شروع ہوگیا تھا، عہد فاروقی میں پانچ صحابہ، عبداللہ بن عبداللہ بن عتیق انصاری، عاصم بن عمرو تمیمی (جو فتح عراق میں حضرت خالد بن ولید کی فوج میں شامل تھے) قبیلۂ بنو عبدالقیس کے صحار بن عبدی، سہیل بن عدی اور حکم بن ابی العاص ثقفی کا ذکر ملتا ہے، اس طرح حضرت عثمان غنی کے عہد میں عبیداللہ بن معمر تمیمی مدنی، عبدالرحمن بن سمرہ (جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے) اور حضرت امیر معاویہ کے عہد میں سنان بن سلمہ ہذلی، جو سندھ تشریف لائے، ان میں بعض حضرات کے راویان حدیث میں شامل ہونے کی صراحت ملتی ہے، اور عمومی طور پر صحابہ کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی نسبت سے پہنچتے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتے۔

اس عہد کے بعد موسیٰ بن یعقوب ثقفی (جو محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے تھے) یزید بن ابی کبشہ سکسکی دمشقی (جن کو سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم کی جگہ مقرر کیا) تابعی تھے اور ماہرین رجال نے ان کو ثقہ راوی شمار کیا ہے، بخاری میں بھی ان کی روایت ہے، مفضل بن ابی صفراء، ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری (جن کے تلامذہ میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے محدثین ہیں) عمرو بن سفیان ثوری، ربیعہ بن صبیح بصری، جو حسن بصری کے شاگرد تھے اور جن کو اسلام میں پہلا مصنف قرار دیا گیا ہے، جیسے اہل علم اور علماء حدیث پہلی اور دوسری صدی ہجری میں وارد ہند ہوئے، پھر سندھ کے شہر دیبل اور سندھ ہی میں محمد بن قاسم کے قائم کئے ہوئے شہر منصورہ کو مشرق میں اشاعت علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس وقت سے یہاں علم حدیث کی خدمت کا تسلسل قائم رہا۔

عام طور پر علماء ظاہر اور علماء باطن میں چشمکیں رہتی ہیں لیکن ہندستان میں صوفیا کی خدمت کا ایک امتیازی پہلو یہ رہا ہے کہ دہلی اور اس کے مشرق ومغرب کے علاقوں میں علم حدیث کی نشر واشاعت صوفیا اور ان کی خانقاہوں سے ہوئی، شاہ نظام الدین اولیاء (جن کے فیض کا دائرہ دور دور تک وسیع تھا) نے اپنی شہرت ومقبولیت کے عروج کے زمانہ میں علم حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا کمال الدین زاہد کا تلمذ اختیار کیا اور ان سے ''مشارق الانوار'' پڑھی، جو تدریسی نقطۂ نظر سے ہندستان میں مقبول ترین کتاب تھی، حدیث

کی وجہ سے وہ صلاۃ جنازہ علی الغائب، قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور سماع کے مسئلہ میں فقہائے احناف سے اختلاف رکھتے تھے، آپ کے شاگردوں میں شمس الدین اودھی ہیں، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، فخر الدین دہلوی ہیں، جن کی تالیف ''کشف القناع عن وجوہ السماع'' کا مخطوطہ اب بھی موجود ہے، ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مصنف فیروز شاہ برنی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور سید محمد گیسو دراز، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح بھی لکھی اور فارسی میں اس کا ترجمہ بھی کیا، نیز معروف فقیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کے تلامذہ میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء سے بھی بڑھ کر جنھیں علم حدیث میں شہرت حاصل ہوئی، وہ مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی شخصیت ہے، انھوں نے سونار گاؤں میں اپنے استاذ اور خسر ابوتوامہ حنبلی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی، ان کے مکتوبات اور تصوف سے متعلق تالیفات میں کثرت سے احادیث منقول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پورے ہندستان میں سب سے پہلے انھوں نے ہی صحیحین کی تعلیم شروع کی، ان کے شاگردوں میں شیخ مظفر بلخی، حسین بن معز بہاری اور احمد لنگر دریا علم حدیث کی نشر و اشاعت اور تصنیف و تالیف میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

تیسری شخصیت سید علی ہمدانی کی ہے، جن کے ذریعہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی اور درس حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا، انھوں نے ''السبعین فی فضائل امیر المومنین'' (جو اہل بیت کے فضائل میں ہے) اور ''اربعین فی الحدیث'' لکھی، ان کے شاگردوں میں سید جلال الدین اور قاضی حسین شیرازی قابل ذکر ہیں، قاضی شیرازی ہی نے بابا رتن ہندی سے متعلق احادیث جمع کیں، جو صحابی رسول ہونے کا مدعی تھا۔ چوتھی شخصیت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی ہے، ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے محدث جمال الدین کے علاوہ سید جلال الدین بخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ثانی الذکر بھی قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور صلوٰۃ جنازہ علی الغائب کے سلسلے میں شاہ نظام الدین اولیاء کے نقطۂ نظر پر تھے، اس طرح ہندستان میں اشاعت حدیث کے سلسلے میں صوفیاء کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض بڑے بڑے محدثین جو عالم عرب میں اپنے عہد میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ خود ہندستان میں وارد ہوئے یا ہندستان سے جا کر وہاں کسب فیض کر کے واپس آئے، حافظ ابن حجر عسقلانی سے براہ راست استفادہ کرنے والوں میں ہمیں یحییٰ بن عبد الرحمن ہاشمی شافعی کا نام ملتا ہے، جن کے علم کا فیض گلبرگہ سے جاری ہوا اور ایک واسطہ سے تلمذ حاصل کرنے والوں میں جنوبی ہند کے مشہور عادل حکمراں محمود گاواں ہیں، جنھوں نے ایک عظیم الشان مدرسہ کی بھی بنیاد رکھی، اسی طرح علامہ عبد الرحمن سخاوی کے شاگردوں میں ابوالفتح بن رضی مکی، احمد بن صالح عمر بن محمد دمشقی، عبد العزیز بن محمود طوسی شافعی، وجیہ الدین محمد مالکی، حسین بن عبد اللہ کرمانی اور جمال الدین محمد جو بحرق کے نام سے معروف تھے، نیز رفیع الدین صفوی کا تذکرہ ملتا ہے، جن میں سے زیادہ تر شخصیتیں دکن کی مختلف مسلمان سلطنتوں میں فروکش تھیں، یہ سب براہ راست علامہ سخاوی

کے شاگرد تھے۔علامہ ابن حجر ھیثمی کے تلامذہ شیخ عبداللہ عیدروسی، ابوالسعادہ محمد فاکہی حنبلی، میر مرتضیٰ شریف شیرازی اور محمد میر کلاں محمد سعید بن مولانا خواجہ ہیں، جو محدث اکبر آبادی کے نام سے معروف تھے، اول الذکر دونوں بزرگوں کا علمی مرکز گجرات میں قائم ہوا اور ثانی الذکر دونوں شخصیتوں کا آگرہ میں، اس طرح مشہور دبستانِ حدیث جو عالم اسلام میں پائے جاتے تھے، ان کا فیض ہندستان تک پہنچا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جس کے مختلف خطوں میں درس حدیث کی گونج رہی ہے، سندھ کو تو اس میں اولیت حاصل ہے ہی؛ لیکن دکن، گجرات، دہلی، جونپور، بہار، بنگال، لکھنؤ، لاہور اور مالدہ وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور ہندستان کی خاک سے متعدد ایسی شخصیتیں اُٹھتی رہی ہیں، جن کے علم کی روشنی نے عالم اسلام کو بھی منور کیا ہے، ان میں شیخ علی متقیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، شیخ علی متقی (متوفی: ۹۷۵ھ) نے احادیث پر متعدد کتابیں مرتب کی ہیں، جن میں ''کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' کو ایسی عالمگیر شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی، جو کم کتابوں کے حصہ میں آئی، اس کے علاوہ انھوں نے فقہی ابواب کی ترتیب پر ''الجامع الصغیر'' اور زیادۃ الجامع الصغیر کا مجموعہ بھی ''منہاج العمال'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جو اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، اس دبستانِ درس کی شخصیتوں میں شیخ ابوالحسن سندھی (متوفی: ۱۱۳۸ھ) محشی صحاح ستہ ہیں، جنھوں نے پہلی بار مسند احمد کی شرح لکھی اور جو اب تک تشنۂ طبع ہے، ان کے صاحبزادے علامہ محمد حیات سندھی، علامہ ابوطیب سندھی جن کی شرح جامع ترمذی پر ہے اور ''عقود الجواہر المنیفہ فی اصول ادلۃ مذہب ابی حنیفہ'' کے مصنف علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی (متوفی: ۱۲۰۵ھ) اور علامہ محمد عابد سندھی (متوفی: ۱۲۵۷ھ) جنھوں نے مسند امام ابی حنیفہ کی ''المواہب اللطیفہ'' کے نام سے شرح لکھی ہے، نیز بلوغ المرام کی شرح بھی تالیف فرمائی ہے، اسی درسگاہ کے کواکب و انجم ہیں۔

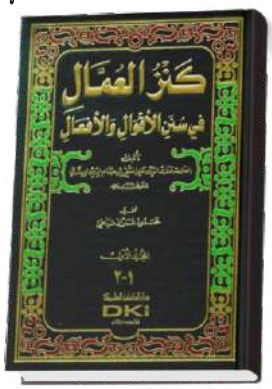

شیخ کے شاگرد علامہ طاہر پٹنی حنفی کو علم حدیث کی خدمت میں جو شہرت حاصل ہوئی، وہ محتاجِ اظہار نہیں، ان کی تالیفات ''المغنی فی ضبط الرجال، تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات والضعفاء، مجمع بحار الانوار'' مطبوعہ ہیں اور ''اسماء الرجال'' مخطوطہ کی شکل میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، ان ہی علماء میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں، جنھوں نے مختلف موضوع کی تیئس کتابوں پر شرحیں اور حواشی لکھے ہیں، ہندستان کے محدثین میں ایک زندہ و پائندہ نام علامہ حسن صنعانی لاہوری (متوفی: ۶۵۰ھ) کا ہے، جنھوں نے علوم اسلامی کی تحصیل کے لئے حجاز اور عراق کے بکثرت اسفار کیے، انھوں نے احادیث موضوعہ پر قلم اُٹھایا، جو رسالۃ الموضوعات کے نام سے چھپ چکا ہے، مشارق الانوار کے نام سے (۲۲۵۳) احادیث کا بخاری و مسلم سے انتخاب کیا، یہ کتاب ایک زمانے تک ہندستان کے تدریسی اُفق پر چھائی رہی اور اس کو تشریح و ترجمہ کے

اعتبار سے بھی اہل علم کی بڑی توجہ حاصل ہوئی، ان کی فہرست تصانیف میں رجال پر ”کتاب الضعفاء والمتروکین“ کے نام سے بھی ایک کتاب کا نام ملتا ہے۔

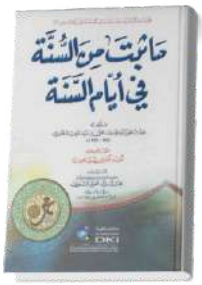




ہندستان میں علم حدیث کی تدریس وتالیف کو فروغ دینے والی ایک نہایت اہم شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے، جنھوں نے ہندستان میں ”مشکوۃ المصابیح“ کے درس کو رواج دیا اور اس کی شرح عربی میں ”لمعات التنقیح“ اور فارسی میں ”اشعۃ اللمعات“ کے نام سے لکھی، آپ کی ایک اہم تالیف ایام ولیالی کے فضائل اور اعمال سے متعلق ”ماثبت بالسنۃ“ کے نام سے مطبوعہ ہے، شاہ عبدالحق صاحب نہ صرف خود حدیث کا درس دیا اور تالیف وتصنیف کے ذریعہ علم حدیث کی خدمت کی؛ بلکہ ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی، جس سے بہت سے اہل علم نے استفادہ کیا اور بڑے بڑے محدثین وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے، جن میں خود شیخ کی اولاد واحفاد میں شیخ نورالحق ہیں ، جن کی بخاری پر ”تیسیر القاری“ کے نام سے پانچ جلدوں میں ایک جامع شرح چھپ چکی ہے، اور اسی خاندان کے ایک اور بڑے عالم سلام اللہ محدث رام پوری ہیں، مؤطا امام مالک پر عربی زبان میں ان کی شرح ”المحلی باسرار المؤطا“ کے نام سے مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ شیخ عبدالحق کی درسگاہ سے استفادہ کرنے والوں میں بابا داؤد مشکاتی کشمیری بھی ہیں، جن کو پوری مشکوۃ حفظ تھی، ان ہی میں میر غلام علی آزاد بلگرامی بھی ہیں، جو مشہور مصنف، مؤرخ اور فارسی کے ادیب تھے، جن کی تالیفات میں ”سبحۃ المرجان فی آثار ہندستان“ (مطبوعہ ۱۳۰۳ھ) اور ہندستان سے متعلق احادیث پر ”شمامۃ العنبر فی ماورد فی الہند عن سید البشر“ کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی۔

شاہ عبدالحق صاحب کے بعد جس شخصیت نے ہندستان میں باضابطہ درسگاہ حدیث کی بنیاد رکھی اور حدیث کے فیض کو دور دور تک پہنچایا۔ وہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جنھوں نے حجاز کا سفر کیا اور وہاں سے حدیث کا تحفہ لے کر آئے، اس وقت ہندستان کی علمی فضا پر معقولات کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، انھوں نے ہندستان واپس آ کر مؤطا امام مالک، صحاح ستہ، مسند دارمی اور مشکوۃ کا درس شروع کیا، شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردوں میں شاہ عبدالعزیز صاحب، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا محمد عاشق پھلتی، خواجہ امین ولی اللہی، مولانا خیرالدین سواتی اور مولانا بشیرالدین مرادآبادی جیسے نابغۂ روزگار علماء شامل ہیں، جن کے ذریعے پورے ہندستان میں حدیث کی نشر واشاعت ہوئی اور درس حدیث کی ایک نئی تحریک نے جنم لیا، شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کرنے والوں میں شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی اور شاہ محمد اسحق جیسے اہل علم ہوئے، دیوبند اور سہارنپور کا سلسلہ حدیث شاہ محمد اسحق صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب سے مربوط ہے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کے ایک اور شاگرد میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی سے اہل حدیث مکتبہ فکر کا رشتہ جڑا ہوا ہے، اس

طرح اس وقت برصغیر میں حدیث کے جو مدارس ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ عبدالعزیز صاحب سے ملتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہندستان کے آسمان علم وتحقیق پر نیر تاباں بن کر طلوع ہونے والی شخصیات میں غالباً سب سے نمایاں نام مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی کا تھا، وہ علوم اسلامی کی جامعیت، حدیث وفقہ میں یکساں تبحر اور تقلید کے ساتھ ساتھ تحقیق اور فکر ونظر میں عدل واعتدال کا ایسا نمونہ ہیں، جن کو شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر کا عکس جمیل قرار دیا جاسکتا ہے،

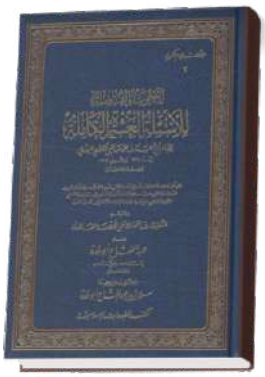

وہ بنے بنائے راستے پر قناعت کرنے کے بجائے نئے راستے بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ابداعی فکر کے مالک تھے، انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، حدیث کے رد وقبول کے سلسلے میں سند کے علاوہ دوسرے قرائن اور روح درایت کی اہمیت کو انھوں نے بڑی قوت کے ساتھ اور مدلل طور پر پیش کیا، اس سلسلے میں ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' اُصولِ حدیث کے پورے کتب خانے میں امتیازی حیثیت کی حامل کتابیں ہیں، جو بعد کے اہل علم کے لئے سرمۂ چشم بنیں؛ اسی لئے ممتاز محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی جو توجہ مولانا لکھنوی کی تالیفات کو حاصل ہوئی، شاید ہی کسی اور عالم کے حصہ میں آئی ہو۔

اسی دور میں ہندستان میں ایک دوسری شخصیت نواب صدیق حسن خاں کی ابھری، جو اس دیار میں مسلک اہل حدیث کے مؤسسین میں ہیں؛ البتہ ان کے یہاں اعتدال اور ائمہ متبوعین کا پورا احترام بھی ہمیں نظر آتا ہے، فقہ الحدیث پر ان کی تالیف ''نزل الابرار'' کے علاوہ ان کی اور بھی متعدد کتابیں ملتی ہیں اور خاص طور پر انھوں نے ہندستان میں علامہ شوکانی کے علوم وافکار کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موقعے پر علامہ شوکانی کے ایک تلمیذ رشید محدث حسین بن محسن انصاری یمانی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جو اپنے عہد کے مشہور اساتذۂ حدیث میں تھے۔ بڑے بڑے اہل علم خاص کر ندوۃ العلماء کے اکابر نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان سے استفادہ کرنے والوں میں ہیں، ان کی تالیف ''التحفة المرضية في حل بعض المشكلات الحديثية'' نقد حدیث کے موضوع پر بڑی اہم کتاب ہے، جس میں دوسری بحثوں کے بہ شمول حدیث کے رد وقبول میں تلقی بالقبول کی اہمیت پر بڑی چشم کشا گفتگو کی گئی ہے۔

مدارس حدیث کی جہد مسلسل ہی کا نتیجہ ہے کہ حدیث کے موضوع پر اُردو فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی ہمیں علماء ہند کی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ نظر آتا ہے؛ چنانچہ متونِ حدیث کو جمع کرنے میں شیخ علی متقی ہندی کی ''کنزالعمال'' ایسی شہرہ آفاق اور جامع تالیف ہے، جس کی شہرت ذکر وتعارف سے ماوراء ہے، پھر ماضیٔ قریب میں مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی ''آثار السنن''، مولانا ظفر احمد عثمانی کی ''اعلاء السنن'' اور مولانا عبداللہ شاہ محدثِ دکن کی ''زجاجۃ المصابیح''، حنفی نقطۂ نظر سے احکام حدیث کے ایسے جامع اور وقیع مجموعے ہیں، جن کی عالم اسلام کے علماء نے بھی داد دی ہے۔

شروح حدیث میں بخاری پر مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حواشی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''لامع الدراری''، مولانا انور شاہ کشمیری کی ''فیض الباری''، مسلم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کی ''فتح الملہم''، سنن ابی داؤد پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی ''عون المعبود''، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی ''بذل المجہود'' اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کی ''انوار المحمود''، سنن ترمذی پر مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی ''تحفۃ الاحوذی''، مولانا انور شاہ کشمیری کی ''العرف الشذی''، مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ''معارف السنن'' اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الکوکب الدری''، سنن نسائی پر مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الفیض السماوی'' اور مؤطا امام مالک پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''المسوی''، نیز مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی مفصل شرح ''اوجز المسالک''، مؤطا امام محمد پر مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کی ''التعلیق الممجد'' امام ابو یوسف کی کتاب الآثار پر مولانا ابوالوفاء افغانی کی ''تعلیقات''، امام محمد کی کتاب الآثار پر مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری کی ''قلائد الازہار''، نیز سنن دارقطنی پر مولانا شرف الدین عظیم آبادی کی التعلیق المغنی اور شرح معانی الآثار پر مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی امانی الاحبار وغیرہ نہایت اہم تالیفات ہیں۔

اُصولِ حدیث کے موضوع پر مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی لکھنوی کی ''ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی''، شاہ عبدالحق صاحب کا مقدمہ فی اصولِ الحدیث از روئے درایت نقد حدیث کے سلسلے میں مولانا لکھنوی کی ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' کے علاوہ اعلاء السنن پر مولانا ظفر احمد عثمانی کا، فتح الملہم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا، تحفۃ الاحوذی پر مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کا، اوجز المسالک پر مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا اور لامع الدراری پر مولانا محمد عاقل سہارنپوری کا مقدمہ بلند پایہ تحریریں ہیں، اسی طرح محدث یمانی کی التحفۃ المرضیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب کی بعض تالیفات نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

رجال کے سلسلے میں علامہ پٹنی کی ''المغنی فی ضبط الاسماء'' کے علاوہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی ''الاکمال فی اسماء الرجال'' اور طحاوی کے رجال پر مولانا محمد ایوب سہارنپوری کی ''تراجم الاحبار'' وغیرہ اہم تالیفات ہیں، اسی طرح تخریج حدیث میں مولانا حبیب اللہ مختار کی ترمذی کی احادیث الباب پر ''کشف النقاب'' ایک مفید ترین کام ہے، جو افسوس کہ مکمل نہیں ہو پایا۔

یہ تو ان تالیفات میں سے کچھ اہم کتابوں کا ذکر ہے، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے؛ لیکن برصغیر میں اُردو زبان میں بھی حدیث کے موضوع پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آچکا ہے، جس میں متونِ حدیث کے ترجمے بھی ہیں، صحاحِ ستہ اور حدیث کی بعض اور کتابوں کی مختصر، متوسط اور تفصیلی شرحیں (جو زیادہ تر دروس کے مجموعے ہیں) بھی ہیں، اُصولِ حدیث پر بھی مختصر اور مفصل مستقل کتابیں اور عربی کی اہم کتابوں کے ترجمے موجود ہیں، حدیث کے انکار کے فتنے کی بیج یوں تو مستشرقین نے بوئی اور اس کا پہلا اثر مصر کی بعض مغرب زدہ شخصیتوں نے قبول کیا؛ لیکن یہ فتنہ تقریباً اسی دور میں ہندستان میں بھی پہنچ گیا اور یہاں بعض معروف شخصیتیں اس گمراہی کا شکار ہوئیں، اس پس منظر میں حدیث کی حجیت، عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت اور حدیث کے استناد و اعتبار پر علماء نے پوری تحقیق، بصیرت، دینی حمیت اور سلف صالحین کے نقطۂ نظر پر استقامت کے ساتھ نہ صرف قلم اٹھایا؛ بلکہ اس پر پورا کتب خانہ تیار کر دیا اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ اس جہت سے علماء ہند کی خدمات عالم عرب سے بھی زیادہ وقیع ہیں، اس سلسلے میں علامہ

سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روایات کی سند و متن اور نقد و درایت کی جہتوں سے تنقیح و تحقیق کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تلمیذ سعید علامہ سید سلیمان ندوی کی کوششیں ایک حد تک اس وقت تک کی ان تالیفات سیرت پر بھی بھاری ہیں، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی متعدد اہم تالیفات وہ ہیں، جن پر تحقیق و تعلیق کی خدمت علماء ہند نے انجام دی ہے، اس سلسلے میں ''مسند امام اعظم'' امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار، مصنف عبد الرزاق، مسند ابو یعلی اور سنن سعید بن منصور'' پر علماء ہند کی علمی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ہندستان میں مولانا ابو الوفاء افغانی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات اس سلسلہ میں ناقابل فراموش ہیں، نیز عصر حاضر میں ڈاکٹر مصطفی اعظمی اور مولانا ابو اللیث خیر آبادی وغیرہ خدمت حدیث کے سلسلہ میں عالمی سطح پر معروف ہیں اور ان کی تصنیفات کو عالم عرب میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

ان خدمات کے مختصر اور سرسری ذکر کا مقصد تفاخر اور محض تاریخ کے صفحات کو الٹانا نہیں ہے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے سامنے اپنے بزرگوں کا کارنامہ رہے؛ کیوں کہ قومیں ماضی کے آئینہ میں اپنے مستقبل کو سنوارتی ہیں اور بزرگوں کے نقش قدم پر آئندہ کا سفر طے کرتی ہیں، پس اللہ تعالیٰ خادمین دین کے اس قافلے کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

دکن بھی یہ علم حدیث کے اہم مراکز میں رہا ہے، برہان پور، گلبرگہ، بیجاپور، بیدر اور احمد نگر وغیرہ میں سنی مسلم حکومتوں نے محدثین کی بڑی پذیرائی کی اور انھیں تدریس و تصنیف کے ذریعہ اس علم کی آبیاری کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ماضی قریب میں بھی دکن خاص کر حیدر آباد کا حدیث کی نشر و اشاعت میں بڑا حصہ رہا ہے۔ یہیں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے پہلی بار ''کنز العمال، سنن بیہقی، کتاب الانساب للسمعانی، کتاب الثقات لابن حبان، مشکل الآثار للطحاوی'' وغیرہ جیسی عظیم کتابیں طبع ہوئیں، اور اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا، اسی طرح مولانا ابو الوفاء افغانی کے قائم کردہ ادارہ ''لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ'' کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں، جس سے امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' وغیرہ شائع ہوئیں۔ صحاح ستہ (سوائے سنن ترمذی) کے مترجم اور مفردات حدیث پر عربی اُردو لغت کے مؤلف نواب وحید الزماں حیدر آبادی کا قیام اسی شہر میں تھا اور وہ یہیں کی آغوش میں پروان چڑھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم کی تالیف میں سابق حکومت حیدر آباد ہی نے مالی تعاون کا تحفہ پیش کیا اور بحمد اللہ اس وقت بھی اس دیار میں تدریس و تالیف اور تحقیق و تعلیق کی صورت میں علم حدیث کی خدمت جاری ہے اور متعدد ایسی درسگاہیں ہیں، جہاں صحاحِ ستہ کا درس ہوتا ہے اور لڑکیوں کے لئے تو دورۂ حدیث تک تعلیم کی درسگاہیں ایک درجن سے زیادہ ہیں۔

المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد ایک نو قائم شدہ ادارہ ہے، جس کے قیام پر صرف دس سال پورے ہوئے ہیں، اس کا بنیادی

مقصد مختلف اسلامی علوم اور دینی خدمتوں میں بہتر اور باصلاحیت افراد کی تیاری، نیز علماء کو انگریزی زبان اور عصر حاضر کے علوم سے اس حد تک آشنا کرنا کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی ترجمانی اور تشریح کر سکیں، تفسیر و حدیث، فقہ اور عصر حاضر میں اسلام کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کے موضوعات پر تحقیق، غیر مسلم بھائیوں میں دعوتِ اسلام کی کوشش اور دعوت کی عملی جدو جہد اس کے مقاصد میں شامل ہیں، اور یہ ادارہ بتدریج اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس کا ایک اہم شعبہ حدیث کا بھی ہے، یہاں فقہ حنفی کی معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' کی احادیث کی تخریج کا کام پانچ جلدوں میں ہوا ہے، ایک اہم مخطوطہ ''الادلۃ الشریفۃ علی مذہب ابی حنیفۃ''، علامہ سیوطی کی ''العرف الوردی فی احادیث المہدی'' اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی تخریج بھی عمل میں آئی ہے، ایک فاضل نے اُردو زبان میں حدیث کے سرمایہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور سن دو ہزار تک کی کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے، جن احادیث پر عقلی جہت سے اہل مغرب اعتراض کرتے ہیں، ان پر بھی کام کرایا گیا ہے، موضوع روایات پر اُردو زبان میں ایک تفصیلی مقالہ مرتب ہوا ہے، جس میں وضع حدیث کی تاریخ، علامات، موضوع روایات سے متعلق کتابیں اور زبان زد موضوع روایات کا ذکر کیا گیا ہے اور اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی تفصیلی کتاب ہے، اسی طرح ایک فاضل نے حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلے میں مستشرقین اور مستغربین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ایک اور فاضل نے ان مرویات کو جمع کیا ہے، جن میں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا ذکر ہے، یہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد حدیثیں

ہیں، جو غالباً اس موضوع پر اب تک جمع کی گئی روایتوں میں سب سے زیادہ ہے، ایک فاضل نے ''علماء دیوبند کی خدمات حدیث'' اور ایک اور فاضل نے احناف کی کتب حدیث پر کام کیا ہے، اس وقت طحاوی کی ''شرح معانی الآثار'' پر احادیث کی تخریج اور رجال کی تحقیق کا کام بھی ہو رہا ہے اور علامہ ابن رشد قرطبی مالکی کی ''مختصر شرح معانی الآثار'' پر بھی --- جو ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہے --- کوشش کی جارہی ہے کہ حدیث کی اس اہم کتاب کی شایانِ شان خدمت کی جائے۔ و باللہ التوفیق وھو المستعان۔

...

# الأدب المفرد کی اردو میں شرح وترجمانی: ایک اجمالی خاکہ

ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی
(استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

اخلاقیات اور اسلامی آداب کے موضوع پر حضرات محدثین کے علمی سرمایہ کا جائزہ لیا جائے تو سرفہرست امیر المومنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل البخاری (ت ۲۵۶ھ) کی تصنیف لطیف ''الأدب المفرد'' پر نظر پڑتی ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے امام مالک (ت ۱۷۹ھ) نے ایک رسالہ سپرد قلم کیا، جو رسالۃ مالک إلی ہارون الرشید کے نام سے موسوم ہے، یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۲ صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام موصوف نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی و دنیوی اخلاقی نصائح کیے ہیں۔ ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔(۱)

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے ''مسلمان'' کے نام سے اس رسالہ کی تلخیص وترجمہ کیا ہے، اور دو بار قاضی صاحب کی زندگی میں چھپ چکا ہے۔(۲)

امام مالک اور امام بخاری علیہما الرحمہ کے بعد دیگر محدثین نے اسلامی اخلاق وآداب کی طرف توجہ کی، جن میں: ابن ابی الدنیا (ت ۲۸۱ھ) حافظ ابوبکر محمد بن جعفر الخرائطی (ت ۳۲۷ھ) امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۳۶۰ھ) ابن حبان البستی (ت ۳۵۴ھ) ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (ت ۶۷۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آخر الذکر کی ''ریاض الصالحین'' کو ہر دور میں اہمیت دی گئی، لیکن امام بخاری کی ''الأدب المفرد'' کی طرف اہل علم بہت دیر میں متوجہ ہوئے، گو یہ کتاب اپنی فنی خصوصیت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے، امام موصوف نے انداز تصنیف منفرد اور جداگانہ اختیار کیا ہے، کثرت ابواب، صحتِ اسناد ہر پہلو سے امتیازی شان بلکہ مستقل دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں امام صاحب نے ان احادیث رسول، آثار صحابہ اور اقوال واحوال تابعین کو چھوٹے چھوٹے ابواب کے تحت جمع کیا ہے، جو ایک مسلمان فرد کی دینی و اسلامی زندگی کے لیے معیار ہیں، یہ کتاب اسلامی اخلاقیات کے لیے جامع قوانین ہے۔(۳)

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ حافظ ابن حجر عسقلانی (ت ۸۵۲ھ) کے اس بیان سے ہوتا ہے:

اس کتاب کی تقریباً نصف احادیث صحیح بخاری کے مرتبہ کی ہیں، اور نصف احادیث سے کم صحیح مسلم کے مرتبہ کی ہیں، اور باقی حدیثیں صحت میں سنن سے زیادہ مرتبہ کی ہیں، نیز اس میں امام بخاری نے ان بہت سی احادیث کو موصول بیان کر دیا ہے جن کو صحیح

بخاری میں تعلیقاً درج کیا ہے، اس میں وہ احادیث بھی ہیں جن کے کسی راوی یا کسی لفظ کے بارے میں محدثین کو ذہول ہوگیا تھا۔

امام بخاری نے ان کو اس کتاب میں نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے، اور اس کی سب سے نمایاں اہمیت وخصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے آثار واخبار ہیں جو احادیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، ان تمام خصوصیات کی وجہ سے ''الادب المفر'' اسلامی اخلاق وآداب کے ساتھ احادیث وآثار کا مستند ترین مجموعہ ہے۔(۴)

حافظ ابن حجر نے ''الادب المفر'' کا مختصر تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

**الأدب المفرد يشتمل على أحاديث زائدة على ما في الصحيح، وفيه قليل من الآثار الموقوفة، وهو كثير الفائدة۔(۵)**

اور مؤلف علیہ الرحمہ سے اس کے راوی کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہے: ''ومن تصانيفه ايضاًالأدب المفرد يرويه عنه أحمد بن محمد بن الجليل-بالجيم-البزّار۔(٦)

اس کتاب میں کل (۶۴۴) ابواب اور (۱۳۲۲) حدیثیں ہیں اور شیخ البانی کی تحقیق کے مطابق صحیح حدیث (۹۹۳) اور ضعیف حدیث (۲۱۷) ہیں۔

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ظاہریہ دمشق، خدا بخش لائبریری پٹنہ، اور تین نسخے کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں ہیں۔

یہ کتاب ہندوستان میں سب سے پہلی بار ۱۳۰۶ھ میں مطبع خلیلی شاہ آباد، آرہ۔ بہار، میں چھپی، اور ڈاکٹر فواد سیزگین کی تحقیق کے مطابق اس کتاب کے استنبول (ترکی) میں چھپنے کا سن بھی ہیں ہے قسطنطنیہ میں یہ کتاب دوبار شائع ہوئی، پہلے ایڈیشن پر سن طباعت نہیں ہے، حاشیہ پر امام محمد حسن الشیبانی (ت ۱۸۰ھ) کی ''الجامع الصغیر'' درج ہے اور دوسری بار ۱۳۰۹ھ میں اور حاشیہ **مسند الإمام أبي حنيفة** سے آراستہ ہے۔

پیر ۱۳۴۹ھ میں مطبع الشیخ عبدالواحد بن الحاج محمد التازی قاہرہ سے محمد عیاد الخمیسی کی تصحیح سے طبع ہوئی، ناچیز کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں یہی نسخہ ہے، مذکورہ بالا ایڈیشن کے بعد مصر کے مشہور فہرست نگار محمد فواد عبدالباقی کے حواشی کے ساتھ ان کا ترقیم کردہ نسخہ منظر عام پر آیا۔

ان تمام مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر مولانا فضل اللہ بن احمد علی بن مولانا محمد علی مونگیری (ت ۱۹۷۹ء) سابق استاذ تفسیر وحدیث جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے ''الادب المفرد'' کی بہترین شرح فضل اللہ الصمد فی توضیح الأدب المفرد کے نام سے تیار کی، جو ۱۳۷۸ھ میں حجاز کے مشہور تاجر اور صاحب خیر یوسف زینل علی رضا کے زیر اہتمام مصر کے مشہور فاضل محب الدین الخطیب کی نگرانی میں پہلی مرتبہ مطبع سلفیہ مصر میں طبع ہوئی، یہ شرح دو جلدوں پر مشتمل ہے، جلد اول کے صفحات (۶۴۸) اور جلد دوم کے (۷۳۶) ہیں اور یہ شرح مشاہیر اہل علم وقلم کی تقریظات سے مزین ہے اور اس شرح کا تعارف وجائزہ کئی اہل علم کے قلم سے شائع ہو چکا ہے، جن

میں قاضی اطہر مبارکپوری (۷) مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (۸) اور حال ہی میں شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک ریسرچ اسکالر ایم ایس ثاقب قاسمی (۹) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور نیز 'معارف' اپریل ۱۹۴۸ء میں اس پر ریویو (Review) شائع ہوا تھا۔

ذیل میں فاضل گرامی مولانا معصومی کے قلم سے فضل اللہ الصمد کا مختصر لیکن جامع تعارف نظر نواز ہے:

کتاب شروع سے اخیر تک یکساں طور پر مبسوط تحقیقات سے آراستہ ہے، شارح نے تصحیح، تخریج احادیث اور ایضاح مطالب کے ساتھ ہر حدیث کی سند اور متن پر حسب ضرورت محققانہ کلام کیا ہے، جس سے معانی و مطالب کا ہر پہلو جھلک اٹھا ہے، رجال و سنن اور دیگر علم و فن کی مستند مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتابوں کے حوالے بکثرت دیتے ہیں۔ (۱۰)

''الأدب المفرد'' کا ایک ایڈیشن ۱۴۱۰ھ میں بیروت سے محمد عبد القادر عطا کے تحشیہ و تخریج سے شائع ہوا ہے۔

> علمائے لغت کہتے ہیں ادب وہ ملکہ ہے جو ناپسندیدہ حرکتوں سے روکتا ہے۔ ادب کی جمع آداب ہے، اور اس کا اطلاق علوم و معارف پر عموماً ہوتا ہے اس میں بھی جو اچھے ذوق کی علامت ہے، علمائے اخلاقیات ان آداب و فضائل کو ادب کہتے ہیں جو کسی شے یا شخص کے لائق ہو اسی طرح آداب درس، آداب قاضی وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔

پھر اخیر میں شیخ محمد ناصر الدین البانی (ت ۱۹۹۹) نے ''الادب المفرد'' کی طرف توجہ کی، شیخ البانی کے کام کی نوعیت بالکل علاحدہ اور گراں قدر ہے، انھوں نے متن کی تحقیق کے ساتھ سند حدیث پر زور دیا ہے، ہر حدیث پر صحاح و سنن کی مشہور کتابوں کی طرح ''الأدب المفرد'' میں جمع شدہ احادیث پر بھی حکم لگایا ہے، حدیث کی فنی اصطلاح مرفوع و موقوف وغیرہ کی تعیین کی ہے، اور تخریج حدیث میں بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے، اور تخریج حدیث میں عموماً اپنی تخریج کردہ کتب کا حوالہ دیا ہے، اور اپنے پیش رو خصوصاً مولانا فضل اللہ گیلانی اور محمد فواد عبد الباقی کی تحقیقات تخریجات پر کافی استدراک و تعقیب کی ہے، کتاب کی شیخ البانی نے دو حصوں میں تقسیم کردی پہلا حصہ ''صحیح الأدب المفرد'' اور دوسرا حصہ گو مختصر ہے ''ضعیف الأدب المفرد'' پر مشتمل ہے، دار الصدیق سعودی عرب سے ۱۴۱۵ھ میں شائع ہوئی ہے۔

ان تمام مطبوعہ نسخوں کو جمع کر کے مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی استاد مدرسہ کاشف العلوم مرکز نظام الدین بستی نئی دہلی نے ۱۴۲۳ھ میں (۹۱۸) صفحات پر مشتمل ایک جلد میں اپنا تیار کردہ نسخہ شائع کیا ہے، مولانا بارہ بنکوی نے مولانا فضل اللہ گیلانی کی شرح حدیث اور شیخ البانی کی تخریج حدیث مع حکم حدیث کو اپنی تعلیقات میں سمو لیا ہے، تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ موصوف نے پوری کتاب میں شیخ البانی کی تخریج کردہ کتابوں کے حوالہ کے بجائے مطبع دار الصدیق کا ذکر کیا ہے علم و تحقیق کی دنیا میں یہ حجاب کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

قسم م

شیخ البانی نے ''صحیح الأدب المفرد'' کے مقدمہ (ص ۲۵) میں ایک جدید ایڈیشن کی نشاندہی کی ہے جو کمال یوسف الحوت کی ترتیب وتقدیم سے عالم الکتب بیروت سے ۱۴۰۵ھ میں شائع ہوا، البانی صاحب کے خیال میں اس ایڈیشن کو پہلے ایڈیشن (مطبع سلفیہ، قاہرہ) کا چربہ بلکہ سرقہ کہنا زیادہ صحیح ہے جسے انھوں نے متعدد مثالوں سے مبرہن کیا ہے۔

استاذ گرامی جناب مولانا واضح رشید ندوی کے ذریعہ ''الادب المفرد'' کا ایک جدید ترین ایڈیشن دستیاب ہوا (جزاہ اللہ خیراً و بارک فیہ) جو دار القلم دمشق سے ۱۴۲۲ھ میں منظر عام پر آیا، اور یہ نسخہ صالح احمد الشامی کی ترتیب واعتنا کا رہین منت ہے، موصوف کے پیش نظر مولانا فضل اللہ گیلانی اور شیخ البانی کا نسخہ خاص طور پر ہے اور ان دونوں خادمان حدیث شریف کا جا بجا حوالہ نظر آتا ہے، اس ایڈیشن میں مرتب نے پوری کتاب کو دس مقاصد میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر مقصد کے تحت کئی کئی فصلیں درج ہیں، تاکہ مرتب کے پیش نظر نئی نسل کے لیے کتاب سے استفادہ کے آسان ہو جانے کا مقصد بر آسکے، بنابریں اصل کتاب کی ترتیب بدل گئی ہے جس کی وجہ سے احادیث و ابواب میں تقدیم وتاخیر کا ہونا لازمی تھا، بلاشبہ مرتب کا یہ عمل اصل کتاب میں تصرف شمار ہوگا، حضرات محدثین کے نزدیک اس طرح کا تصرف ناپسندیدہ ہے۔

اب آئیے تھوڑا سا وقت ''الأدب المفرد'' کے اردو ترجموں کے ساتھ گزاریں:

''الأدب المفرد'' کا پہلا اردو ترجمہ والا جاہ نواب صدیق حسن خاں (ت ۱۳۰۷ھ) نے ''توفیق الباری لترجمۃ الأدب المفرد للبخاری'' کے نام سے کیا، جو ۱۳۰۶ھ میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا، اور یہ ترجمہ رمضان ۱۳۰۶ھ میں ۱۸/ یوم میں مکمل ہوا، ''مآثر صدیقی'' کے مؤلف نواب علی حسن خاں (ت ۱۳۵۵ھ) نے بھی ''توفیق الباری'' کو نواب صاحب کی فہرست مؤلفات میں شمار کیا ہے۔(۱۱)

نواب صاحب کے ترجمہ میں صحت وذکر فوائد حدیث کا التزام کیا گیا ہے گو زبان قدیم ہے، اس مطبوعہ ترجمہ کا ایک نسخہ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی میں نواب علی حسن خاں کے ذخیرہ کتب (Collection) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسرا ترجمہ بنام ''سلیقہ'' مولانا عبد الغفار مہدانوی (ت ۱۸۹۷ء) کا ہے، جو مطبع خلیلی آرہ۔ بہار سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوا، اس ترجمہ کا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، موصوف کا شمار محدث کبیر میاں سید نذیر حسین مونگیری ثم دہلوی (ت ۱۳۲۰ھ) کے تلامذہ میں ہے، مولوی عبد المالک آروی اس ترجمہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''سلیقہ'' پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا (مہدانوی) نے ترجمہ میں متقدمین کا اسلوب بالکل ترک کر دیا ہے، ان کی عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے، قدیم تراجم کی طرح بیان کی پے چیدگی اور انشاء کی ژولیدگی نہیں پائی جاتی.....ترجمے کی کام یابی اور کتاب کی افادی خصوصیات کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بغض مت رکھو، حسد مت کرو، اترا مت جایا کرو، خدا کے بندو! سب کے سب بھائی بن جاؤ اور مسلمان کا مسلمان کو تین دن سے زیادہ چھوڑ دینا حلال نہیں۔(۱۲)

مولانا مہدانوی کے اس ترجمہ کے متعلق مولانا سید عبدالحی حسنی (ت ۱۳۴۱ھ) کو امام ترمذی کی زبان میں وہم ہوگیا ہے اس لیے کہ مولانا عبدالحي نے ''سلیقہ'' کو مولانا ابومحمد ابراہیم آروی (ت ۱۳۱۹) کے مؤلفات میں ذکر کیا ہے۔(۱۳) جب کہ یہ ترجمہ مولانا عبدالغفار مہدانوی کا ہے۔

ہمارے استاذ فاضل گرامی مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کو یہ مغالطہ ہوا کہ آپ نے ''طریق النجاۃ'' جو کہ مولانا ابراہیم آروی کی تصنیف ہے، اسے الأدب المفرد کا اردو ترجمہ شمار کیا ہے۔(۱۴) مولانا کی اتنی بات صحیح ہے کہ 'طریق النجاۃ' مولانا ابراہیم آروی کی تصنیف ہے لیکن ''طریق النجاۃ'' کے متعلق موصوف کا یہ کہنا کہ ''الأدب المفرد'' کا ترجمہ ہے درست نہیں، بلکہ یہ ''مشکوۃ المصابیح'' کی صحاح کا ترجمہ ہے، اگر مولانا کے پیش نظر ''طریق النجاۃ'' کا پورا نام یا نسخہ ہوتا تو اس مغالطے میں کہیں پڑتے، کتاب کا پورا نام یہ ہے: ''طریق النجاۃ فی ترجمۃ الصحاح من المشکوۃ''۔

مولانا محمد مستقیم سلفی نے بھی ''الادب المفرد'' کا ایک اردو ترجمہ مولانا ابومحمد ابراہیم آروی کی طرف منسوب کیا ہے(۱۵) جو تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

سنت اور صاحب سنت

ادب نام ہے ہر پسندیدہ کاوش کا جو انسان کی ایک فضیلت ہے، اخلاق کی خوبیوں کو اپنالینا، اور دوسرے الفاظ میں پسندیدہ خصلتوں کو عادت بنالینا، یا یوں کہیے پسندیدہ بات ہو یا کام اس کی عادت ڈال لینا ادب ہے۔

تیسرا ترجمہ بنام ''کتاب زندگی'' مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا ہے جو نفیس اکیڈمی کراچی سے جنوری ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، شروع میں تدوین حدیث کا ایک مختصر خاکہ اور اصول حدیث کی ضروری اصطلاحات بھی شامل ترجمہ ہے، ترجمانی کی زبان سلیس ہے لیکن ترجمہ میں بکثرت غلطیاں اور کمزوری دکھائی دیتی ہے۔

''الادب المفرد'' کا ایک اور اردو ترجمہ مع ضروری فوائد عربی متن کے ساتھ مولانا خلیل الرحمان نعمانی کے قلم سے ہے جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔(۱۶)

اس موقع پر بھی عرض کرتا چلوں کہ 'الادب المفرد' کا ایک ترجمہ ملیالم زبان میں ایک ندوی فاضل ڈاکٹر بہاء الدین احمد نے کیا ہے، جو ۱۴۱۸ھ میں کیرالہ سے شائع ہوا، ترجمہ عربی متن سے آراستہ ہے۔

کچھ عرصہ قبل ندوۃ العلماء کے سابق استاذ جناب مولانا اقبال احمد اعظمی (حال مقیم برطانیہ) نے ''الادب المفرد'' کا ترجمہ بزبان انگریزی تیار کر دیا تھا منظر عام پر آنے کا علم نہیں۔

مولانا معصومی کا خیال ہے کہ امام سیوطی نے اسی کتاب کے منتخب مجموعہ کا نام ''المنتقی من الأدب المفرد'' رکھا تھا۔(۱۷)

شاہ عبد العزیز (ت ۱۲۳۴ھ) نے ''بستان المحدثین'' میں کتب اخلاقیات کے تذکرہ میں ''الادب المفرد'' کا نام سرفہرست لیا ہے۔

آپ کے ذہن میں یقینا یہ سوال اٹھ رہا ہوگا کہ ''ادب'' کا مفہوم ومعنی کیا ہے؟ حافظ ابن حجر نے ''ادب'' کی تعریف اس طرح کی ہے:

الأدب استعمال مایحمد قولا وفعلا۔

وعبر بعضهم عنه بأنه الأخذ بمكارم الأخلاق۔

وقيل: الوقوف مع المستحسنات۔

وقيل: هو تعظيم من فوقك والرفق بمن دونك.

وقيل: إنه مأخوذ من المأدبة، وهي الدعوة إلى الطعام، سمي بذلك لأنه يدعى إليه. (۱۸)

حافظ ابن حجر کی ادب کی ان تعریفات کو ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی کے الفاظ میں مزید اضافے کے ساتھ ملاحظ فرمائیں:

> ادب نام ہے ہر پسندیدہ کاوش کا جو انسان کی ایک فضیلت ہے، اخلاق کی خوبیوں کو اپنالینا، اور دوسرے الفاظ میں پسندیدہ خصلتوں کو عادت بنالینا، یا یوں کہیے پسندیدہ بات ہو یا کام اس کی عادت ڈال لینا ادب ہے، اور اس کی یہ بھی تعریف کی گئی ہے کہ جو تم سے بڑا ہے اس کا اکرام اور جو چھوٹا ہے اس پر شفقت ادب ہے۔ علمائے لغت کہتے ہیں ادب وہ ملکہ ہے جو ناپسندیدہ حرکتوں سے روکتا ہے۔ ادب کی جمع آداب ہے، اور اس کا اطلاق علوم ومعارف پر عموماً ہوتا ہے اس میں بھی جو اچھے ذوق کی علامت ہے، علمائے اخلاقیات ان آداب وفضائل کو ادب کہتے ہیں جو کسی شے یا شخص کے لائق ہو اسی طرح آداب درس، آداب قاضی وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ (۱۹)

اب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے ترجمہ ''الادب المفرد'' بنام ''ارشادات نبوی کی روشنی میں نظام معاشرت'' کا تعارف وجائزہ اور خصوصیات وامتیازات ملاحظہ فرمائیں:

> ڈاکٹر صاحب کے ترجمہ کی تفصیلات ذکر کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے لسانیات کا بڑا ستھرا ذوق عطا فرمایا ہے، عربی، فارسی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور ان زبانوں کی ادبیات اور نوک وپلک کی نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور ترجمانی پر بڑی قدرت رکھتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ''المرتضیٰ''، ''روائع من ادب الدعوۃ'' بنام ''تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب''، ''الی شاطی النجاۃ'' بنام ''خطرناک تکبر'' کے ترجمے کے علاوہ ''قصیدہ بانت سعاد'' اور ''قصیدہ بردہ'' کا اردو ترجمہ ''ردائے رحمت'' کے نام سے پیش کر کے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اب آیئے ڈاکٹر صاحب کے زیر نظر ترجمہ ''ارشادات نبوی کی روشنی میں نظام معاشرت'' پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی جائے

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے ’الأدب المفرد‘ کی ترجمانی میں سلاست، روانی اور برجستگی کے ساتھ آسان اور عام فہم زبان اختیار کی ہے۔
۲۔ لفظی ترجمے کے بجائے متن حدیث کی روح کی ترجمانی مترجم کے پیش نظر ہے۔
۳۔ مشکل مقامات پر بین القوسین میں توضیحی نوٹ دیے ہیں۔
۴۔ جا بجا حدیث سے مستنبط فوائد ذکر کیے ہیں۔
۵۔ بعض الفاظ حدیث کی اردو میں جدید تعبیر پیش کی ہے۔
۶۔ متن حدیث میں مستعمل بعض اصطلاحات اور دینی مفاہیم کی تشریح کی گئی ہے۔
۷۔ جن احادیث کا تعلق کسی خاص قصے یا واقعے سے ہے تو وہاں ڈاکٹر صاحب نے واقعہ نگاری اور تصویر کشی کا اسلوب اپنایا ہے۔
۸۔ بعض مقامات پر فنی بحثیں بھی کی ہیں۔
۹۔ ’’جوامع الکلم‘‘ پر مشتمل احادیث کی بڑی دلنشیں ترجمانی فرمائی ہے۔
۱۰۔ حدیث کی جن تعمیرات کا اردو میں ترجمہ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے ان مقامات کا حق ادا کر دیا ہے۔
۱۱۔ جنت و جہنم میں دخول کے وعدہ کو اول وہلہ یا گناہوں کی سزا اور عام معافی میں اس کو صغائر یا کبائر سے مقید کیا گیا ہے۔
۱۲۔ عناوین باب کو مؤثر اور جاذب نظر اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔
۱۳۔ کہیں کہیں بعض اعلام (شخصیات) کا مختصر تعارف بھی درج ہے۔
۱۴۔ متن حدیث کی تصحیح کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے اس کے لیے متعدد نسخہ ہائے ’الأدب المفرد‘ کو سامنے رکھ کر ایک مصحح منقح نسخہ تیار کیا گیا ہے ورنہ ترجمے میں کہیں کہیں فروگزاشت کا امکان باقی رہتا ہے۔
۱۵۔ عربی متن اور اردو عبارت میں انداز تحریر کا جدید اسلوب اپنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی دوسری اہم امتیازی خصوصیات ہیں جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جا رہا ہے اب آپ کے سامنے ترجمہ کتاب سے ایک نمونہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے ترجمانی کی سلاست و روانی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، حدیث نمبر ۴۶۱ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

> حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کا عمل اس کو نجات نہیں دلا سکتا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اور آپ کا عمل بھی نجات نہیں دلا سکتا؟ ارشاد فرمایا: اور نہ میں (اپنے عمل سے نجات پا سکتا ہوں) سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھک لے، لہٰذا میانہ روی اختیار کرو اور توسط و اعتدال سے کام لو اور شام اور رات کے کچھ حصہ میں بندگی کرو، راہِ اعتدال کو ہمیشہ اپنا مطمح نظر بناؤ، منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے‘‘۔

(یہ حدیث مختلف الفاظ و پیرایہ بیان میں متعدد مقامات پر وارد ہوئی ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور

ضرور کرو، مگر اس حد تک کہ دنیا کے دوسرے کام پس پشت نہ ڈال دیئے جائیں۔ بچوں کی پرورش، اہل خانہ کے لیے نان نفقہ کا جائز اور حلال طریقہ سے حصول، کھیتی باڑی، تجارت وصنعت وغیرہ چھوڑ کر صرف نماز روزہ میں لگ جانا شریعت کی تعلیمات کے خلاف ہے، سورۂ منزل میں انتہائی معجز بیانی کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ رات کو عبادت کے لیے اٹھو تو خیال رہے کہ تم کو دن میں بھی کام کرنا ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ نصف شب آرام کے لیے اور نصف یا اس سے کم عبادت کے لیے خاص کرلو، اور اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ جسمانی عبادت زیادہ کرنے سے یا اپنے اوپر مشقت زیادہ ڈال دینے سے وہ نجات پا جائے گا، یہ غلط ہے، خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پچھلے اور آئندہ کی تمام بشری لغزشوں کو پہلے ہی معاف کر دیا گیا تھا اگر مزید خلوت گزینی اختیار کرتے تو یہ عبادتیں ان کو نجات نہ دلا سکتی تھیں کیونکہ نجات تو صرف اللہ کا عطیہ ہے، لہٰذا ''قاربوا وسددوا، القصد القصد'' میانہ روی اختیار کرو، زیادہ تیز نہ بھاگو، مقصد کو ہمیشہ اپنا ہدف بنائے رکھو، دوسری حدیثوں میں اس مضمون کو یوں بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر تم چاہو کہ عبادت سے لڑو یعنی اتنی عبادت کرو کہ پھر کوئی گوشہ باقی نہ رہ جائے تو تم بھی جیت نہیں سکتے بلکہ دین کے مطالبات تم کو پچھاڑ دیں گے، ایک جگہ فرمایا گیا کہ گھوڑے کو اتنا تیز نہ بھگاؤ کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے اور تم مسافت کا کوئی حصہ طے نہ کرسکو، خلاصہ یہ ہے کہ اعتدال وتوسط کی ضرورت عبادت میں بھی ہے۔ ع ع ن)

ڈاکٹر صاحب کی شرح وتر جمانی کی پہلی جلد جو (۲۷۱) ابواب (۶۰۳) احادیث اور (۴۲۴) صفحات پر مشتمل ہے، ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۴ء بعد نماز مغرب کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی (ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے زیریں ہال میں اہل علم ودانش کی پروقار مجلس میں رسم اجرا کی تقریب سعید کے موقع پر منظر عام پر آئی۔

الحمدللہ کہ یہ بارونق تقریب بدست مبارک حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی انجام پائی، جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے گرامی قدر جناب مولانا شاہ شبیر عطا ندوی اور خانوادہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے نمائندہ مولانا شاہ ہلال احمد قادری نے شرکت کی۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (ندوۃ العلماء) نے پاریکھ آفسیٹ پریس لکھنؤ سے اس کتاب کو شائع کیا، دوسری جلد زیر طباعت ہے ان شاء اللہ العزیز جلد شائع ہونے کی امید کی جاتی ہے (یسر اللہ طبعہ)۔

فاضل مترجم نے انتساب کتاب اپنے استاد حدیث کبیر علامہ شاہ سلیم عطاء سلونوی (ت ۱۳۷۵ھ) کے نام کیا ہے۔ کتاب کے شروع کے صفحات حسب ذیل مندرجات پر مشتمل ہیں:

- عرض ناشر: پیش کردہ صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- ابتدائیہ:
- امام بخاری اور ان کا علمی سفر نامہ (سوانحی خاکہ جو کہ دراصل محب الدین الخطیب کے مضمون کا ترجمہ ہے) از فاضل مترجم
- مقدمہ کتاب: بقلم فاضل جمیل حضرت مولانا محمد سالم قاسمی

کتاب کے آخر میں فہرست ابواب جلد اول ص: ۴۱۲-۴۲۴، ۱۳ر صفحات میں ہے۔

اس کتاب کی راقم نے جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف فاضل مترجم نے اپنے ''ابتدائیہ'' میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

.....ابوسحبان روح القدس ندوی نے ترجمے کو عربی نص سے ملا کر دیکھنے اور عربی متن میں جو غلطیاں دوسری طباعتوں میں رہ گئی تھیں ان سے اس کو محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ میں بڑی جانفشانی اور محنت سے کام کیا، تاکہ یہ کتاب متن اور ترجمہ دونوں لحاظ سے قابل اعتماد ہو، اس سلسلے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو نوجوان فاضل محمد فرمان نیپالی اور محمد سلمان نسیم سلمہما نے عزیز موصوف کا بھرپور تعاون کیا، خاکسار مترجم ان تمام حضرات کا دل سے شکر گزار اور ان کے حق میں دعا گو ہے۔

# حوالہ جات

(۱) حیات مالک از علامہ سید سلیمان ندوی (مجلس نشریات اسلام، کراچی) ص ۱۸ نیز دیکھیں تذکرہ محدثین ۱/ ۴۲۔

(۲) قاضی اطہر مبارکپوری: مآثر و معارف ص: ۲۲۲۔

(۳) ایضاً ص ۲۲۳۔

(۴) بحوالہ مصدر سابق ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

(۵) فتح الباری ۱۰/ ۴۰۰۔

(۶) ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۲۔

(۷) مآثر و معارف ص ۲۲۲۔ ۲۲۶، دہلی ۱۹۷۱ء

(۸) برہان دہلی اگست ۱۹۵۰ء ص ۴۱-۵۶۔

(۹) ترجمان دارالعلوم نئی دہلی جون ۲۰۰۴ء ص ۴۲-۴۷۔

(۱۰) برہان اگست ۱۹۵۰ء ص ۴۳۔

(۱۱) مآثر صدیقی مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۳۴۳ھ حصہ چہارم (فہرست کتب مؤلفہ والا جاہ ص ۶) نیز ملاحظہ فرمائیں: ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی (ت ۱۹۶۶ء) تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۹۹ دہلی جید برقی پریس ۱۳۵۶ھ۔

(۱۲) جامعہ جلد اول اکتوبر ۱۹۳۴ء ص ۳۲۳-۳۲۴۔

(۱۳) الاعلام بمن فی الہند من الاعلام ۸/ ۱۲۔

(۱۴) برہان فروری ۱۹۵۱ء ۱۰۶ (حاشیہ پر)

(۱۵) جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات ص ۵۷ بنارس ۱۴۲۲۔

(۱۶) علمائے مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی تصنیفی خدمات ۲/ ۸۴ دیوبند ۱۴۰۳ھ از محمد شاہد سہارنپوری۔

(۱۷) برہان اگست ۱۹۵۰ء ص ۴۲ نیز دیکھیں کشف الظنون ۱/ ۴۹۔

(۱۸) فتح الباری ۱۰/ ۴۰۰۔

(۱۹) ارشادات نبوی کی روشنی میں نظام معاشرت ۱/ ۸۷۔

...

# متفرقات

# تحقیق مقاصد اور مناہج

شاہ اجمل فاروق ندوی

تحقیق کے سلسلے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تحقیق کو ایک علم سے تعبیر کرتے ہیں تو کچھ لوگ اسے ایک فن کہتے ہیں۔ بعض لوگ تحقیق کو ایک شوق اور دل چسپی کا نتیجہ بتاتے ہیں تو کچھ لوگ اسے ایک انسانی ضرورت سے تعبیر کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تحقیق ان میں سے کوئی ایک چیز نہیں، بل کہ ان تمام چیزوں کا سنگم ہے۔ بغیر ذاتی ذوق وشوق کے تحقیق انجام نہیں دی جاسکتی، تحقیق کو ایک فن (Art) کے طور پر نہ برتا جائے تو صحیح معنوں میں تحقیق نہیں کی جاسکتی۔ اسے ایک علم (سائنس / Science) کے طور پر اختیار نہ کیا جائے تو اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اسے ایک انسانی ضرورت کی تکمیل کا وسیلہ سمجھ کر اختیار نہ کیا جائے تو وہ تحقیق برائے تحقیق یا بے معنی تحقیق بن کر رہ جائے گی۔ مختصر یہ کہ تحقیق ایک علم بھی ہے، فن بھی ہے، نتیجۂ شوق بھی ہے اور ایک انسانی ضرورت بھی۔ اسے ان چاروں حیثیتوں سے اختیار کیا جانا چاہیے اور ان میں سے ہر حیثیت کو پورے شعور اور احساس ذمے داری کے ساتھ برتنا چاہیے۔ نیچے دیا گیا یہ نقشہ تحقیق کی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے:

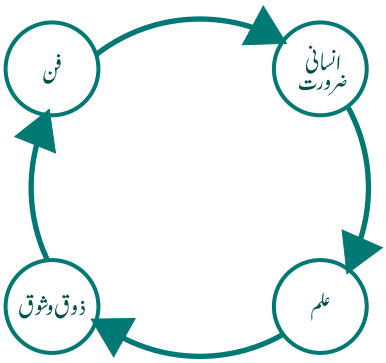


## تحقیق کے مقاصد

اصحابِ علم وتحقیق نے تحقیق کے متعدد مقاصد بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ہر مقصد کو اہمیت حاصل ہے۔ کسی کو بے اصل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس موضوع پر ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ڈاکٹر عبدالحمید خان عباسی، ڈاکٹر خالق دار ملک، عبدالرزاق قریشی، پروفیسر خورشید احمد سعیدی، پروفیسر محمد باقر خان خاکانی، ڈاکٹر عمر فاروق غازی اور ڈاکٹر طفیل ہاشمی نے اپنی اپنی تحریروں میں تحقیق کے جو مقاصد بیان کیے ہیں، ان کو مختصر طور پر یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

### (۱) کسی مخفی حقیقت کو دریافت کرنا

درحقیقت یہ مقصد ہی اصل مقصد ہے۔ دوسرے مقاصد تحقیق میں بھی یہی مقصد جاری وساری رہتا ہے۔ حقیقت کا ادراک اور نئے

گوشوں کی دریافت ہی تحقیق کا مقصد ہوتا ہے۔

**(۲) کسی غلطی کی اصلاح**

کبھی کبھی تحقیق کے ذریعہ کسی علمی، فکری اور نظریاتی عام غلطی کی اصلاح کرنا بھی مقصد ہوتا ہے۔ یعنی کسی موضوع پر اہل علم کے درمیان کوئی نظریہ عام ہوگیا ہو لیکن ہماری دریافت کہتی ہو کہ وہ نظریہ غلط ہے تو تحقیق کے ذریعہ اس عام غلطی کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔

**(۳) کسی آلے کی ایجاد**

انسانی ضرورت کو دیکھتے ہوئے کوئی مشین یا آلہ ایجاد کرنا بھی تحقیق کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسانوں کو حاصل سہولیتیں اسی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

**(۴) منتشر مواد کو یکجا کرنا**

بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں، جن کے متعلق ہمارے پاس معلومات کا ایک جنگل ہوتا ہے، لہٰذا محقق اس کی چھان پھٹک کرکے مرتب انداز میں پیش کر دیتا ہے۔

**(۵) کسی ابہام کی توضیح**

کبھی کبھی ہمارے پاس کسی مسئلے کے متعلق کوئی دستاویز موجود ہوتی ہے، لیکن اس سے استفادہ کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے محقق اسی دستاویز کی تنقیح، توضیح، تشریح اور تعلیق کا کام انجام دے کر اس سے استفادے کو ممکن بنا دیتا ہے۔ یہ بھی ایک اہم تحقیقی عمل ہوتا ہے۔

تحقیق کے مذکورہ بالا مقاصد زیادہ عام اور زیادہ رائج ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی مقاصد ہیں جنھیں اہل علم نے بیان کیا ہے۔

## تحقیق کے مناہج

موجودہ زمانے میں تحقیق کے بہت سے طریقے رائج ہیں۔ ان میں سے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، یہ چیز تحقیق کے موضوع پر منحصر ہوتی ہے۔ تحقیق کے موضوع کے لحاظ سے وہ طریقۂ تحقیق اختیار کیا جاتا ہے جو اس کے لیے زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اس طریقۂ کار کا استعمال تحقیق کے عمل کو زیادہ مفید اور زیادہ سائنٹفک بنا دیتا ہے۔ موجودہ دور میں تحقیق کے یہ طریقے رائج ہیں:

**(۱) بنیادی تحقیق** (Basic Research)

یہ ایسی تحقیق ہوتی ہے جو کسی چیز کے بارے میں صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یعنی اس کا مقصد عملی ہوتا ہے، عمل نہیں۔ اس تحقیق میں کسی موضوع کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کی جاتی ہے اور ان معلومات کو اچھے انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس میں عملی پہلو موجود نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے درخت سے سیب گرتے دیکھا اور اس کے بعد اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ زمین کے اندر قوت ثقل موجود ہے۔ موجودہ دور کے مشہور سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ نے معلومات جمع کرکے بتایا کہ کائنات میں بلیک ہول موجود ہیں۔ یہ تحقیقات بنیادی تحقیق کے خانے میں آتی ہیں۔ ان میں معلومات

اور اس کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس بات کا پورا امکان ہے کہ بنیادی تحقیق کسی نہ کسی زمانے میں عملی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

### (۲) اطلاقی تحقیق (Applied Research)

اس تحقیق کو کسی نظریے کی جانچ پرکھ کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اطلاقی تحقیق بنیادی تحقیق کے بعد کا مرحلہ ہے۔ کسی صاحب علم کے ذریعہ پیش کی گئی تحقیق کس حد تک درست ہے یا اس میں مزید کن گوشوں کی گنجائش ہے؟ یہ تمام باتیں اطلاقی تحقیق کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اوپر پیش کی گئی ایک مثال بلیک ہول کے وجود کا نظریہ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ لیکن یہ نظریہ کتنا درست ہے؟ اس کا فیصلہ ہاکنگ کے بعد آنے والے محققین کریں گے۔ یہ تحقیق اطلاقی تحقیق کہلاتی ہے۔

لکھنے سے پہلے آپ کا ذہن صاف ہونا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کو کیا لکھنا ہے، کیوں لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے؟ اپنے موضوع کے ساتھ آپ کو شب و روز بسر کرنے چاہییں۔ تاکہ آپ جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ کہا جا سکے کہ اس موضوع کا نہ صرف آپ نے حق ادا کیا ہے بلکہ اس سے بہتر اب تک نہیں لکھا گیا۔ لکھتے وقت کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنی چاہیے۔ آپ کی تحریر میں زاویہ نظر کا ہونا ضروری ہے اور زاویہ نظر اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ آپ آخر کیوں لکھنا چاہتے ہیں؟

### (۳) تاریخی تحقیق (Historical Research)

اس تحقیق کا اطلاق ماضی سے وابستہ چیزوں کے لیے ہوتا ہے۔ ماضی کے واقعات، اشیا، مقامات اور حقائق کی دریافت اور چھان پھٹک اس تحقیق کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ مخطوطات، کھنڈرات اور سکوں وغیرہ پر کی جانے والی تحقیق اسی ذیل میں آتی ہے۔ ماہرین نے تاریخی تحقیق کے لیے متعلقہ چیز کے وجود کا زمانہ، مقام اور علاقہ، اسے بنانے والے، اس میں استعمال ہونے والے مادے، اس پر گزرنے والے حالات اور موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت کو تاریخی تحقیق کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ذریعہ صحیفہ ہمام ابن منبہ کی دریافت اسی زمرے میں آتی ہے۔ اسلامی علوم کا دامن اس تحقیق کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

### (۴) بیانیہ تحقیق (Descriptive Research)

یہ ایک توضیحی یا تشریحی تحقیق ہوتی ہے۔ اس تحقیق میں اپنے زمانے کے مسائل، نظریات اور اشیا کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس تحقیق کا مستقبل سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ معاشرے میں فلاں مسئلہ کیوں ہے؟ اس سے کتنے لوگ متاثر ہو رہے ہیں؟ اس کے کیا نقصانات ہیں؟ ان نقصانات کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ یہ تمام موضوعات، بیانیہ تحقیق کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس تحقیق میں مستقبل

کے لیے تجاویز بھی پیش کی جاتی ہیں، جو محقق کے تجربات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر سچر کمیٹی رپورٹ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

**(۵) تجرباتی تحقیق** (Experimental Research)

یہ تحقیق خاص طور پر سائنس اور ٹکنالوجی سے جڑی ہوئی ہے۔اس میں ایک محقق کوئی نظریہ قائم کرکے تحقیق شروع کرتا ہے کہ اگر فلاں چیز کو ایسا کر دیا جائے تو کیا ہوگا، فلاں چیز میں ایسی تبدیلی کر دی جائے تو کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ یہ تحقیق بالعموم کارگاہ (Lebaurtry) میں انجام دی جاتی ہے۔اس کا تعلق خاص طور پر انسانی مفادات کے لیے استعمال ہونے والی عام یا محدود چیزوں کے لیے ہوتا ہے۔

تحقیق کے متعلق اس مختصر اصولی تحریر کا اختتام جمیل جالبی کے جملوں پر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر جمیل جالبی نے نیشنل بک کونسل آف پاکستان، لاہور کے ایک سمینار میں پیش کیے گئے اپنے لیکچر کا اختتام ان سات رہنما ہدایات پر کیا تھا:

(۱) تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھنی چاہیے اور تحقیق کے دوران میں اپنی ذات اور تعصبات کو الگ کرکے معروضی انداز سے اصل حقیقت کو تلاش کرنا چاہیے۔

(۲) کسی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر غور و فکر کے بعد جو کچھ آپ کو لکھنا ہے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔

(۳) تنقید میں بے اعتبار مفروضات، چلتے ہوئے نتائج اور بے بنیاد کلیہ سازی سے گریز کرنا چاہیے۔

(۴) لکھنے سے پہلے آپ کا ذہن صاف ہونا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کو کیا لکھنا ہے، کیوں لکھنا ہے اور کیسے لکھنا ہے؟

(۵) اپنے موضوع کے ساتھ آپ کو شب و روز بسر کرنے چاہییں۔ محنت سے جی نہیں چرانا چاہیے۔تاکہ آپ جو کچھ لکھیں وہ ایسا ہو کہ کہا جاسکے کہ اس موضوع کا نہ صرف آپ نے حق ادا کیا ہے بلکہ اس سے بہتر اب تک نہیں لکھا گیا۔

(۶) لکھتے وقت کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنی چاہیے اور اس طور پر کہ وہ دوسروں تک بغیر کسی اشکال کے پہنچ جائے۔تنقید کے لیے واضح سبق ضروری ہے۔

(۷) آپ کی تحریر میں زاویہ نظر کا ہونا ضروری ہے اور زاویہ نظر اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ آپ آخر کیوں لکھنا چاہتے ہیں؟

اس میں اور بھی کئی باتوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن سر دست اتنا کافی ہے۔

* * *

سہ ماہی کتاب وسنت

کے آن لائن مطالعے کے لیے اسکین کیجیے:

یا دیکھیے:

Website. www.kitabosunnat.in